اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

جنوری ۲۰۲۰ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 January 2020

بلامعاوضہ

سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور قرآنی حلقوں میں
قرآن حکیم کا ترجمہ سکھانے کی منفرد کتاب

تدریس القرآن ①

- صرف ایک پارہ پڑھنے سے سارے قرآن کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔
- پانچویں سے اوپر کی جماعتوں کے لیے موزوں
- جدید اور سائنٹفک انداز۔ عربی گرامر کی الجھنوں اور رٹے سے دور
- اساتذہ اور طلبہ (وطالبات) کے لیے الگ کتابیں
- اساتذہ کے لیے فری ٹریننگ

تدریس القرآن فاؤنڈیشن

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون: 0309-4607124، 0333-4287640

خدمتِ قرآن میں ڈاکٹر محمد امین کا ایک اور منفرد کام

''قرآنی الفاظ کے ترجمے کی بجائے قرآن کی عربی عبارت کے مفہوم کی اردو میں منتقلی''
اسلاف اور جمہور مفسرین کی مطابقت کے ساتھ

رواں، سلیس اور شستہ اسلوب
صرف اردو ترجمہ پڑھیں تو بھی لطف آئے اور بات پوری طرح سمجھ میں آئے
اور تفسیر و حواشی سے بڑی حد تک بے نیاز کرے

پنج سورہ

الفاتحہ، یٰسٓ، الرحمن، الواقعہ، الملک و پارہ عمّ

سفید کاغذ اور مضبوط گتے کی جلد، صفحات ۶۷
ہماری لاگت مع ڈاک خرچ ۱۶۰ روپے

ہدیہ: خدمت قرآن میں آپ کو شریک کرنے کے لیے صرف ۱۰۰ روپے
بذریعہ: وی پی، منی آرڈر، موبی کیش (اکاؤنٹ نمبر 0306-4640366)

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

٭ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰ صفحات
٭ اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
٭ تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
٭ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
٭ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۱۶۰
٭ تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰
٭ تدریس القرآن ① برائے طلبہ و طالبات	۷۲
٭ پنج سورہ (اُردو تفہیم، ڈاکٹر محمد امین)	۷۶
٭ ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
٭ نصابِ مدنیؒ	۴۰
٭ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
٭ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
٭ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
٭ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
٭ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
٭ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
٭ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۳

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

مکتبہ البرہان، A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
0309-4607124

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۲۴، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۲۰ء/ ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ

مشمولات

O فکر و نظر

بیمار معاشرہ ۴

O تعلیم، تربیت، تزکیہ

- ہمارا نظامِ تعلیم : نیا ماحول، نئی اقدار — ڈاکٹر محمد امین — ۵
- طلبہ یونین پر پابندی برقرار رہنی چاہیے — ۹
- فکری انتشار کا بنیادی سبب - ہمارا جدید نظام تعلیم — محمد ندیم اعوان — ۱۰
- مدرسہ ڈسکورسز — مدیر — ۱۸
- تربیتِ اولاد کے دو اہم اصول — خواجہ مظہر صدیقی — ۲۱
- تزکیۂ نفس نہ ہونے سے معاشرے کی تباہی — حافظ محمد موسیٰ بھٹو — ۲۳

O فہم اسلام

عصرِ حاضر میں اسلام کا سیاسی نظام کیسا ہونا چاہیے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۲۷

O پاکستانیات

- سوشلزم کے مردہ گھوڑے کو زندہ کرنے کا سٹنٹ — مدیر — ۵۰
- ناقابلِ یقین: وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی مشرف کے حق میں ریلی — پروفیسر ملک محمد حسین — ۵۲

O تبصرۂ کتب

کتاب نما — مدیر — ۵۴

علامہ خلیل الرحمٰن قادری اور حافظ محمد موسیٰ بھٹو کی تصانیف

O اشاریہ

البرہان ۲۰۱۹ء - ایک نظر میں — ادارہ — ۵۶

فکرونظر

بیمار معاشرہ

❁ وکلاء اور ڈاکٹروں کے رویے نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا جدید نظام تعلیم اسلامی اور اخلاقی قدروں کا قاتل ہے۔

❁ کیا چار چار سال کے بچوں بچیوں کا ریپ بھی ہماری آنکھیں نہیں کھولتا؟

❁ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہ اسلامی اور اخلاقی قدوں پر عمل کے لحاظ سے ایک بیمار معاشرہ ہے لیکن لگتا ہے کہ ہم نے اس کو لاحق بیماریوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور ہم بے حِس ہو گئے ہیں۔ جو ہوتا ہے ہوتا رہے، ہمیں کیا؟ یہ رویہ عام والدین ہی کا نہیں، حکمرانوں کا بھی ہے اور علماء کرام اور دینی لوگوں کا بھی ہے۔ ایسے میں اس بیمار معاشرے کا علاج کون کرے گا؟

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

یہ ''نیا'' پاکستان ہے، یہ ''نیا'' اسلام ہے، یہ ریاست مدینہ ہے؟

ہمارا نظامِ تعلیم – نیا ماحول، نئی اقدار

- طلبہ استاد کو پیٹتے ہیں۔ طالبات جنسی طور پر ہراساں کرنے کے جھوٹے الزام لگاتی ہیں۔
- کالج اور یونیورسٹیاں مخلوط تعلیم، فحاشی، عریانی، دوستیاں کرنے اور منشیات اور زنا کے اڈوں پر جانے کے لیے پروگرام طے کرنے کی جگہ بن چکی ہیں۔
- میڈیا، پہلے شہوت کی ''آگ'' بھڑکاتا ہے پھر تماشہ دکھاتا اور واویلا کرتا ہے کہ دیکھو اخلاق اور کردار کا گھی پگھل رہا ہے۔
- حکمران خوش ہیں کہ تعلیم عام ہو رہی ہے، لبرل اور ماڈرن معاشرہ فروغ پذیر ہے۔ ''نیا پاکستان'' اور ''ریاست مدینہ'' وجود میں آ رہی ہے۔
- والدین خوش اور مطمئن ہیں کہ اولاد پڑھ رہی ہے، اچھی ملازمت ملے گی، اچھی تنخواہ لگے گی۔
- علماء کرام اور دینی عناصر ''دوسرے'' اہم دینی کاموں میں مصروف ہیں۔ جدید تعلیم کے چار کروڑ مسلمان طلبہ کی تعلیم اور اسلامی تربیت ان کا موضوع اور مسئلہ ہی نہیں۔

طلبہ و استاد میں رشتہ

''استاد طلبہ کے لیے والد کی طرح قابل عزت اور قابل احترام ہوتا ہے'' یہ پرانے زمانے کی پرانی قدر تھی۔ نئی قدر یہ ہے کہ وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر الطاف حسین صاحب کو طلبہ کے ایک گروپ نے گھسیٹ کر کار سے نکالا اور جی بھر کر زدو کوب کیا۔ کوئی انہیں چھڑانے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ ملتان میں طلبہ نے ایک پروفیسر محمد اعجاز کو اس لیے سرعام خوب مارا پیٹا کہ اس نے ایک فنکشن میں بعض طلبہ کو ان کی ''خرمستیوں'' پر ٹوکا تھا۔ پھر اتنا ''دباؤ'' ڈالا گیا کہ وہ بیچارہ پولیس میں رپورٹ کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ بعض لوگوں نے اسے ہلاشیری دی تو اس نے پولیس میں درخواست دے دی لیکن اتنی اور ایسی دھمکیاں دی گئیں کہ اس نے ڈر کر رپورٹ واپس لے لی۔

اس سے پہلے ایم اے او کالج لاہور کے ایک لیکچرر محمد افضل نے خودکشی کر لی کیونکہ بی ایس کی ایک طالبہ نے اس پر جنسی طور پر ہراساں کرنے کا جھوٹا الزام لگایا جس سے اس کی زندگی ذلت ورسوائی کا پیکر بن کر رہ گئی۔ حکومت کی ہائی پاور کمیٹی نے انکوائری کے بعد یہ ''منصفانہ'' فیصلہ کیا کہ واقعے کے ذمہ دار کالج پرنسپل کو تبادلے کی ''سزا'' دی البتہ متعلقہ طالبہ کو کچھ نہیں کہا۔ میڈیا نے اطلاع دی ہے کہ اس طرح کے جنسی طور پر حراساں کرنے کے جھوٹے الزامات کے کئی اور کیس بھی پراسیس میں ہیں۔

یونیورسٹی تعلیم

یونیورسٹیاں دنیا میں اعلیٰ تعلیم وتحقیق کے ادارے ہوتی ہیں۔ اکبر الٰہ آبادیؒ اور سید مودودیؒ نے ان کالجوں یونیورسٹیوں کو مسلمان بچوں کی ''قتل گاہیں'' قرار دیا تھا لیکن یہ پرانی باتیں ہیں۔ نئے زمانے میں کالجوں یونیورسٹیوں کا کردار یہ ہے کہ یہ نوجوان مسلم طلبہ وطالبات میں دوستیاں کرنے کی جگہ ہیں۔ طالبات ٹی شرٹ پینٹ پہنے، بال کٹے ہوئے، ٹائٹ جینز، گہرا گلہ، سلیو کہاں ہے؟ دوپٹہ کیا ہوتا ہے؟ ہمارے ایک پروفیسر دوست نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی میں سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ دیکھا ایک لڑکا لڑکی کا بازو پکڑے کھینچ رہا ہے کہ آؤ چلیں۔ لڑکی کہہ رہی ہے کہ کہاں جانا ہے؟ لیکن وہ کھینچتا ہوا لڑکی کو لے گیا کہ آؤ تو سہی، بتاتا ہوں۔ اور یہ تو محض ابتداء ہے۔ یونیورسٹی دراصل نوجوان لڑکے لڑکیوں کے مل بیٹھنے اور دوستیاں کرنے کی بلکہ ''اگلا پروگرام'' طے کرنے کی جگہ ہے۔ یونیورسٹیوں کے قریب ایسے باقاعدہ اڈے ہیں جہاں شیشہ، آئس (نشہ) شراب اور زنا کی کھلی چھٹی ہوتی ہے اور لڑکا اپنی پسند کی دوست لڑکی اور لڑکی اپنی پسند کے دوست لڑکے کو لے کر وہاں جاتی ہے تاکہ.... ہم نے بعض واقفانِ حال کو لاہور کی پرائیویٹ یونیورسٹیوں کو ماڈرن قحبہ خانے کہتے سنا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کئی یونیورسٹیوں کے مالکان ''دین دار'' ہیں، نماز روزے کے پابند، باشرع چہرہ سنت رسول سے مزّین۔ جی ہاں! شاید یہ کوئی ''نیا'' اسلام ہے جس کی عینک پہن کر انہیں یہ سب کچھ عین اسلامی لگتا ہے۔

میڈیا کا کردار

نوجوانوں کے اخلاق تباہ کرنے، لڑکیوں کے گھر سے بھاگ کر اپنی پسند کے لڑکے سے

شادی کرنے کی حمایت کرنے، خاندان کے ادارے کو برباد کرنے، اسلامی معاشرتی قدروں کو دقیانوسی، پرانا، مولویانہ کہہ کر ردّ کرنے اور ڈراموں، فلموں کے ذریعے لڑکے لڑکی کے عشق ومحبت کو عام کرنے میں سب سے بڑا کردار ہمارے الیکٹرانک (اور سوشل) میڈیا کا ہے۔ لیکن ٹھہریے۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ میڈیا کا کردار اس سے مزید آگے چلتا ہے۔ پہلے وہ شیطان کے کہنے پر شہوت کی آگ بھڑکاتا ہے پھر جب اس آگ سے اخلاق وکردار کا گھی پگھلنے لگتا ہے تو وہ شور اور واویلا کرتا ہے کہ دیکھو لوگو! یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس طرح پہلے وہ ایک 'زینب' تخلیق کیے جانے کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ پھر جب اس سے ایک 'زینب' وجود میں آجاتی ہے تو یہی میڈیا انصاف کی دہائی دیتا ہے۔ اس ڈرامے کو گلیمرائز کر کے پیش کرتا ہے یوں اس تماشے کے ذریعے اخلاق کی بربادی اور معاشرے کی تباہی کا کام ہمارا میڈیا کر رہا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے خلاف واویلا کرنے کا کریڈٹ بھی خود ہی لیتا ہے۔ کوئی ہے جو میڈیا اس کے کردار کی مذمت کرے؟ کوئی ہے جو میڈیا کے اس کردار کی اصلاح کی کوشش کرے؟

حکمرانوں (اور حکمران طبقوں) کا کردار

حکمران خوش ہیں کہ وہ تعلیم عام کر رہے ہیں۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ تعلیم کی مختلف سطحوں پر اس وقت زیر تعلیم طلبہ کی تعداد چار کروڑ سے زیادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان چار کروڑ طلبہ کی دینی اور اخلاقی تعلیم وتربیت کا ذمہ دار کون ہے؟ اور وہ اس کے لیے کیا کر رہا ہے؟ یا یہ تعلیم وتربیت سیکولرزم اور لبرل ازم کی بنیاد پر ہو رہی ہے؟ سکولوں میں انگلش میڈیم، آکسفورڈ کا نصاب، او اے لیول کے امتحانات، مخلوط تعلیم، موسیقی کی کلاسیں، سوئمنگ پولز، مغربی لباس کا یونیفارم، کنسرٹ، ناچ گانے، مخلوط پکنک... سوال یہ ہے کہ کون سا 'اسلام' یہ سب کچھ سکھاتا ہے؟ کیا یہ کوئی ''نیا'' اسلام ہے جس کی بنیاد پر ''نیا پاکستان'' وجود میں لایا جا رہا ہے؟ کیا مدینہ کی ریاست ایسی ہوتی ہے؟

والدین کہاں ہیں؟

کیا والدین سو رہے ہیں؟ کیا ان کی آنکھیں نہیں ہیں کہ وہ دیکھیں کہ اپنے بچوں کو وہ جن

سکولوں اور جن یونیورسٹیوں میں بھجوا رہے ہیں، وہاں انہیں کس قسم کی تعلیم دی جارہی ہے؟ وہاں ان کی کس قسم کی تربیت کی جارہی ہے؟ مخلوط تعلیم میں بچوں بچیوں کا حشر کیا ہوگا؟ جب روزانہ چار چار سال کی بچیوں اور بچوں کی ریپ کی خبریں آتی ہیں تو کیا والدین نہیں سوچتے کہ ان کے بچوں کے ساتھ بھی یہ ہوسکتا ہے؟ وہ کس بات میں مگن ہیں؟ کیا اتنا ہی کافی ہے کہ بچے ڈگریاں لے آئیں اور انہیں اچھی ملازمت مل جائے؟ کیا انہیں اس کی بالکل پروا نہیں ہے اور کیا انہیں اس سے ذرا دلچسپی نہیں ہے کہ ان کے بچیاں بچے کس ماحول میں پڑھ رہے ہیں۔ ان کی کیسی اخلاقی تربیت ہورہی ہے؟ اور وہ مستقبل میں کیا بنیں گے؟ کیا ان کا رویہ وہی ہوگا جو بہت زیادہ پڑھے لکھے وکلاء اور ڈاکٹروں کا ہم نے پچھلے دنوں لاہور میں دیکھا؟

علماء کرام اور دینی عناصر

کیا علماء کرام، دینی جماعتیں اور دینی عناصر اس پر مطمئن ہیں کہ جن ''دوسرے'' اہم دینی کاموں میں وہ مصروف ہیں وہ دعوت وانذار اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے قرآنی احکام کے حوالے سے ان کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے کافی ہیں؟ اور معاشرے کی اصلاح کے لیے کافی ہیں؟ اور جدید تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے چار کروڑ طلبہ کے حوالے سے ان کی کوئی ذمہ داری نہیں بنتی؟ کیا وہ اس پیغمبر کے وارث ہیں جسے اللہ نے ''تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس'' کا نسخہ قرآن میں بار بار بتایا تھا اور جس نے ساری زندگی فرد کی تعلیم وتربیت پر محنت کی اور مدینہ میں اسلامی معاشرے اور ریاست کی تعمیر کا کام اس نے انہی افراد کی مدد سے کیا تھا جن پر اس نے تیرا سال تک مکہ میں محنت کی تھی؟ کیا اس اسوۂ نبوی میں ہمارے دینی لوگوں کے لیے کوئی سبق نہیں ہے؟

بقیہ: طلبہ یونین پر پابندی برقرار رہنی چاہیے

یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جن لوگوں نے طلبہ یونین کی حمایت کی موجودہ لہر اٹھائی ہے وہ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا اسلام اور پاکستان دشمن چہرہ واضح ہے، جن کا غیر ملکی اثرات کے تحت ہونا اعلیٰ ترین ریاستی حلقوں میں علی الاعلان زیر بحث آتا رہا ہے اور یہ ''جمہوریت'' ہی ہے جس کی وجہ سے ان اسلام اور پاکستان دشمن عناصر کو نکیل نہیں ڈالی جاسکتی۔ لہٰذا ان عناصر کے مطالبات کو تسلیم کرنا معاشرے اور ریاست کے لیے غیر مفید ہوگا۔

تعلیم و تربیت مدیر

طلبہ یونین پر پابندی برقرار رہنی چاہیے

اصول کی بات یہ ہے کہ نوجوان جب زیر تعلیم ہوں تو انہیں ساری توجہ اپنی تعلیم پر دینی چاہیے۔ عمر کے اس مرحلے میں ہم ان ساری سرگرمیوں کی حمایت کرتے ہیں جو ان کی تعلیمی صلاحیت بڑھائیں۔ وہ طویل گھنٹوں تک لائبریری میں خاموش بیٹھ کر مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیں۔ گروپ ڈسکشن کریں۔ سیمینارز اور کانفرنسوں میں شریک ہوں۔ مباحثوں اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیں۔ ڈائیلاگ فورمز میں جائیں۔ کلاس روم ڈسکشن اور اسائنمنٹ پریزینٹیشن ان کا معمول ہونا چاہیے۔ معتدل انداز میں ورزش اور کھیلوں میں حصہ لینا بھی مفید سرگرمی ہے۔ ہم نصابی سرگرمیوں میں دینی تعلیم وتربیت کی سرگرمیاں بھی شامل ہونی چاہئیں جیسے درس قرآن میں شرکت، ترجمۂ قرآن کلاس یا عربی زبان سیکھنا، جمعہ میں اول وقت نماز میں شمولیت اور پنجوقتہ با نماز جماعت کے لیے مسجد جانا وغیرہ۔ غرض وہ ساری انفرادی اور اجتماعی سرگرمیاں ان کے لیے مفید ہیں جو ان کی صلاحیتوں کو صیقل کریں، مستقبل میں انہیں ایک متحرک اور کامیاب انسان اور مسلمان بنائیں۔

طلبہ یونین کی وہ شکل جو ماضی میں ہمارے ہاں معروف رہی ہے، ہم اس کی حمایت نہیں کرتے کیونکہ اس میں طلبہ کا تعلیمی وتربیتی لحاظ سے نقصان ہے۔ سیاسی اور دینی سیاسی جماعتیں طلبہ میں اپنے گروپ بناتی ہیں۔ وہ باہم کشمکش کرتے، لڑتے اور سر پھٹول کرتے ہیں۔ جامعات میں ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ جو طلبہ تنظیم جیت جاتی ہے وہ یونیورسٹی انتظامیہ کو دباؤ میں لیتی ہے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں کہ وہ خلاف میرٹ طلبہ کے داخلے اور اساتذہ کی بھرتیاں کراتی ہیں اور ملازمین کی ترقی میں مداخلت کرتی ہیں۔ ان سرگرمیوں کی یہ کہہ کر حمایت نہیں کی جاسکتی کہ یہ ''جمہوریت'' کی نرسریاں ہیں اور طلبہ اس سے سیاست کرنا سیکھتے ہیں۔ نوجوانوں کی سیاسی تربیت کے لیے دوسرے ادارے بنانے چاہئیں مثلاً لوکل باڈیز کے الیکشن میں ان کے لیے کوٹہ مختص کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں ہی کو تختۂ مشق کیوں بنایا جائے؟ ہم تو دلائل سے یہ بات کہتے ہیں کہ جس طرح کی ''جمہوریت'' ہمارے ہاں رائج ہے وہ نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ ہمارے معاشرے کے لیے غیر مفید بھی ہے۔ جب جمہوریت خود اصلاح طلب ہے تو اس کی نرسریوں کا اصلاح طلب بن ظاہر و باہر ہے۔ (بقیہ صفحہ: ۸)

تعلیم و تربیت

محمد ندیم اعوان[۱]

فکری انتشار کا بنیادی سبب۔ ہمارا جدید نظام تعلیم

ہر معاشرہ اپنا نظام تعلیم اپنے نظریات پر استوار کرتا ہے لیکن ہم احمقوں کی طرح مغربی نظام تعلیم کی نقالی پر مصر ہیں

جدید تعلیمی نظام اور اس کے دُور رس مہلک و مضر اثرات کے بارے میں آج تک اگر کسی شخص نے انتہائی سادہ، مختصر اور بلیغ انداز میں کلام کیا ہے تو وہ اکبر الہ آبادی ہیں۔ جدید تعلیم پر تنقید کے حوالے سے ان کا ایک شعر زبان زدعام ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ان دو مصرعوں میں انہوں نے اس گہری حقیقت کو واضح کر دیا ہے جسے آج کے دانشور شاید سیکڑوں صفحات اور ضخیم جلدوں میں بھی نہ کر پاتے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں انگریزوں کی خیر خواہی کے پس پردہ چھپے مذموم مقاصد کا بھی، جنہیں انگریز تعلیم کی آڑ میں حاصل کرنا چاہتے تھے، پردہ چاک کیا ہے۔ اس نظام تعلیم کے مہلک و مضر اثرات و نتائج جن کا آج ہم اپنی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں، انہوں نے سو سال قبل اپنی شاعری میں ان کا برملا اظہار کر کے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا مثلاً۔

میں کیا کہوں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے　　بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

وہ جدید تعلیمی نظام کے خوشہ چین طبقے کی اخلاقی حالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں　　کہ جن کو پڑھ کر لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر الہ آبادی مسلمانوں کے لیے جس تعلیمی نظام کے خواہاں اور داعی تھے اسے وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو　　اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو

---

[۱] پشاور، nts143043@gmail.com

بڑھاؤ تجربے، اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو خواصِ خشک و تر سیکھو، علومِ بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ دلوں میں اپنی غیرت کو جگہ دو، جوش میں آؤ

اکبر الہٰ آبادی وہ شخص ہیں جو انگریزوں کے دو اقتدار میں مختلف سرکاری عہدوں پر تعینات رہے۔ ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور مسلسل آٹھ سال تک مقدمات لڑتے رہے۔ ۱۸۹۴ء میں جج مقرر ہوئے، انگریزوں کی طرف سے ''خان بہادر'' کا خطاب بھی ملا اور نو سال منصفی کا فریضہ سرانجام دینے کے بعد ۱۹۰۳ء میں ریٹائر ہوئے، لہٰذا کوئی سیکولر و لبرل دانشور یا پھر روشن خیال جدید تعلیم یافتہ طبقے کا وہ نوجوان جو مغربی تہذیب کا اسیر ہو، اُس کی کبریائی کو قبول کر چکا ہو اور اُسے قبلۂ اوّل و آخر تصور کرتا ہو، اکبر کو اُس کی شاعری کی وجہ سے ''مسجد کا امام'' یا ''مدرسے کا مولوی'' کہہ کر مسترد کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

کیسے ممکن ہے کہ جدید نظام تعلیم کی بات ہو اور اقبال کے افکار و نظریات کو فراموش کیا جائے۔ مفکر اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (جنہیں فقط شاعر مشرق کہہ کر اُن کی مسلّم حیثیت کو گھٹانے، ان کے افکار و نظریات کی وسعت و گہرائی اور چار دانگ پذیرائی کو کسی ملک یا خطے تک محدود کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے) جو جدید نظام تعلیم کے آتشکدہ میں کود پڑے اور ابراہیمی خصوصیات کے ساتھ جب واپس نکلے تو اعلان کیا۔

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم بنارِ او چہ بے پروا نشستم

ترجمہ: میں نے علم حاضر کے جادو کو شکست دے کر وہاں سے دانہ اُچک لیا ہے اور خدا جانتا ہے کہ میں ابراہیمؑ کی طرح اُس آگ میں کس طرح بے پروا بیٹھا رہا۔

اور کبھی فرمایا کرتے تھے۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

آپ جدید تعلیم کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ
اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

موجودہ نظامِ تعلیم کے اثرات ونتائج کے بارے میں آپ یوں گویا ہوئے ۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو　　　ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اِک ڈھیر

آج آپ خلوصِ نیت اور تہہ دل سے جائزہ لیں، آپ کو ہر طرف ذہنی خلفشار وفکری انتشار، اضطراب وتذبذب، نااُمیدی ومایوسی، افراتفری، پریشانی، بے روزگاری، انتہا پسندی، تربیت اور قیادت کا فقدان، ہرطرف پھیلے بے یقینی کے مہیب سائے، نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بے راہ روی، مادہ پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان، سیکولرازم کا ٹھاٹھے مارتا سمندر، لبرل کی تند وتیز آندھی، مغربی تہذیب کی بدتمیزیاں، سامراج کی بدمعاشیاں، عالمی اداروں کی ریشہ دوانیاں، امت مسلمہ کی بے بسی اور تنزلی، ذہنی مرعوبیت، بکھرتے ہوئے خاندانی نظام، پامال ہوتی ہوئی اسلامی اقدار اور بدلتی ہوئی خاندانی ومعاشرتی روایات نظر آئیں گی۔ ہم آج جس عمیق فکری کشمکش اور بحرانی کیفیت کا شکار ہیں اس کی نظیر آپ کو شاید ہماری پوری تاریخ میں نہ ملے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ہر معاملے میں مغرب کو مقتدا اور رہنما تسلیم کرلیا ہے اور خود مختار ہونے کی بجائے ہر معاملے میں ان کے خوشہ چین ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں یہاں تک کہ ''تعلیم اور نظامِ تعلیم'' جس کے ذریعے عقائد وافکار، نظریات وتخیلات، روایات اور قومی منشور کو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کیا جاتا ہے، اُسے بھی مغرب سے امپورٹ کرنے میں دریغ نہیں کرتے، حالانکہ یہ کوئی ایسی شے نہیں جسے کسی دوسرے ملک سے امپورٹ کیا جائے۔ تعلیم یا نظام تعلیم نہ تو کوئی تجارتی سامان ہے نہ مصنوعات، نہ خام مال جو کسی خطے یا علاقے کے ساتھ مخصوص نہ ہو، بلکہ یہ تو ایک ایسا لباس ہے جسے اقوام کے قدوقامت اور جسامت کے ٹھیک ناپ کے مطابق تراشا اور سیا جاتا ہے اور پسندیدہ ومحبوب علم وفن ان کے مقاصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔

وہ ترقی یافتہ ممالک جن کی تعمیر وترقی، ایجادات وانکشافات، اختراعات وتجربات اور نت نئی تحقیقات کے آگے بدترین غلامی میں جکڑے ہوئے مرکزی تعلیمی اداروں میں براجمان ہمارے سیکولر ولبرل عناصر کی رال ٹپکتی ہے، وہ ممالک بھی دیگر ہم فکر وہم خیال ممالک سے نظام تعلیم مستعار لینے کو گوارا نہیں کرتے۔ آپ امریکا ویورپ کو ہی لے لیجیے جو بظاہر عقائد، افکار ونظریات میں مطلق آزادی اور مذہبی رواداری کو تحفظ دینے کے لیے بین الاقوامی قوانین تک

تشکیل دیتے ہیں اور علم وسائنس کے میدان میں تحقیقات وتجربات کو نوع انسانی کا مشترکہ اثاثہ سمجھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ کسی بھی طرح ایسے نظام تعلیم کے روادار نہیں جو کسی بھی پیمانے پر اشتراکیت کا حامی ہو، بلکہ امریکا کے ایک فاضل دانشور ڈاکٹر ''جے بی کانںٹ'' نے اپنی کتاب ''ایجوکیشن اینڈ لبرٹی'' میں لکھا ہے کہ ''تربیت کے اصول وضوابط لین دین اور خرید وفروخت کی چیز نہیں اور نہ کوئی ایسا سامان ہے جس کی درآمد برآمد کی جائے۔ ہم نے ماضی میں یورپی اور برطانوی تعلیمی نظریات کو امریکا میں اختیار کر کے نفع سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے''۔ ایک دوسرے مفکر جان ڈیوی اپنی کتاب ''ڈیموکریسی اینڈ ایجوکیشن'' میں لکھتے ہیں۔ ''قومیں تجدید کے سہارے زندہ رہتی ہیں، اور تجدیدی کوششوں کی بنیاد بچوں کی تعلیم پر قائم کی جاتی ہے۔ قوم مختلف طریقوں سے ناخواندہ افراد میں سے اپنے وسائل اور اپنے نظریۂ زندگی کے لیے صالح ورثا مہیا کرتی ہے اور ان کو اپنے عقائد اور اصولوں کے سانچے میں ڈھالتی ہے''۔

آپ برطانیہ کو لے لیجیے جو زبان، عادات واطوار، تہذیب وتمدن، خیالات، افکار ونظریات اور سیاسی مصالح میں امریکا کے ساتھ باہم شیر وشکر ہے، یہاں تک کہ دونوں ممالک میں پروٹسٹنٹ مذہب کا غلبہ ہے، لیکن تعلیم وتربیت کے معاملے میں ان کا بھی اپنا اپنا موقف ہے۔ برطانیہ کے ایک ماہر تعلیم ''ورنون میلی سن'' نے اپنے مقالے ''An Introduction to the Study of Comparative Education'' جسے ۱۹۵۷ء میں لندن میں شائع کیا گیا، کے صفحہ ۴ میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ ''تعلیم ایک قسم کا ذہنی منشور ہے جو پورے معاشرے کے مشترکہ مقصد اور مشترکہ کوششوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک طرح سے یہ بڑے پیمانہ پر قومی جذبہ کی عکاسی کرتا ہے اور ان خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو معاشرہ کے نصب العین کی خوبی کے لیے ضروری ہوتا ہے''۔ برطانیہ کے معروف اور ممتاز مفکر ''سر برسی لِن'' انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک مقالے میں تعلیم وتربیت کے حوالے سے ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ''لوگوں نے تربیت کی تعریف متعین کرنے میں مختلف رائیں اختیار کر رکھی ہیں لیکن ان تمام میں مشترک، اصل اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تربیت قوم کے بزرگوں اور تربیت دینے والوں کی اس کوشش کا نام ہے جو وہ نئی نسل کو اپنے تعلیم واختیار کردہ نظریۂ زندگی کے مطابق ڈھالنے کے لیے کرتے ہیں اور ایک مدرسہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ

طالب علم میں نظریۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے عوامل کو اثر انداز ہونے کا موقع فراہم کرے اور طالب علم کی ایسی تربیت کرے کہ اس کے لیے اپنی قومی زندگی کی حفاظت اور اس کو آگے بڑھانا ممکن ہو سکے''۔

ایک دوسرے مقالے میں انہوں نے اس بات کو مزید واضح انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ''تعلیم صرف اس عقیدہ کو مضبوط کرنے کا ایک مہذب اور شائستہ طریقہ ہے جس کا حامل یہ ملک وقوم ہے۔ اس کا مقصد فکری طور پر اس کو غذا دینا، اس پر اعتماد کرنا اور اگر ضرورت ہو تو علمی دلائل سے اس کو مسلح کرنا ہے۔ وہ اس عقیدہ کے دوام و بقا کا وسیلہ اور بے کم و کاست آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ نظام تعلیم کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ والدین، مربیوں اور نگرانوں کی اس سعی پیہم کا نام ہے جو وہ اپنی اولاد کو اپنے دین و مسلک پر قائم رکھنے کے لیے کرتے رہتے ہیں اور ان کی اس طرح تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ورثہ کے (جو انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے حاصل کیا تھا) صالح و اہل وارث اور امین ثابت ہوں اور ان کے اندر اس ثروت میں اضافہ وتوسیع اور اس کو ترقی دینے کی پوری صلاحیت ہو''۔

آپ اہل روس کو لے لیجیے جو ہر قسم کی اجارہ داری کے منکر اور کسی بھی قسم کی حدود و قیود اور پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتے، جنھوں نے تمام ادیان و مذاہب کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے اور آزادئ مطلق کے علمبردار ہیں لیکن نظریاتی اور عملی طور پر انہوں نے تمام علوم کو کمیونزم کا تابع کر دیا ہے چاہے وہ سائنسی علوم ہوں، سماجی علوم ہوں، عمرانی علوم ہوں یا پھر جغرافیہ اور تاریخ۔ ان تمام کے تمام علوم میں کمیونزم کے موسسین اور بانیوں کارل مارکس، اینجلز اور لینن کے افکار و نظریات کو نئی نسل تک منتقل کیا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش کے وہ سخت مخالف ہیں۔ ایک روسی ماہر طبیعیات ''میک گاوَرن'' کا کہنا ہے کہ روسی علم عالمی علم کی قسموں میں سے کوئی قسم نہیں بلکہ اس سے الگ اور مستقل بالذات علم ہے جو دوسری قسموں سے بہت مختلف ہے کیونکہ سوویت علم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیادیں واضح اور ممتاز فلسفہ پر استوار ہیں۔ علمی تحقیقات کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہونی چاہیے اور ہمارے علم کی بنیاد وہ مادی فلسفہ ہے جسے مارکس، اینجلز، لین اور اسٹالن نے پیش کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ طبیعیاتی علوم کے میدان میں یہی فلسفہ لے کر داخل ہوں اور پوری قوت اور پامردی کے ساتھ ان تمام نظریات اور فلسفوں کا مقابلہ کریں جو ہمارے مادی، مارکسی فلسفہ سے ٹکراتے ہیں۔''

اس ضمن میں اگر آپ نومولود اور قابض اسرائیلی ریاست کے نصاب ونظام تعلیم کا مطالعہ کریں تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے اور شاید آپ کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں۔ اس بگڑی ہوئی قوم نے اپنے اہداف ومقاصد حاصل کرنے کے لیے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کو اس عرق ریزی کے ساتھ تشکیل دیا ہے کہ سن بلوغت تک پہنچتے ہی طلبہ کو اپنی زندگی کے مقصد سے آشنا کر دیا جاتا ہے اور نظریاتی طور پر ان کی اس انداز سے تربیت کی جاتی ہے کہ وہ مذاہب عالم سے وابستہ دیگر تمام انسانوں کو رذیل، احمق اور چوپائے سمجھتے ہیں اور خود کو ''نجات دہندہ'' اور خدا کی ''چہیتی قوم'' تصور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر راڈرک ماتھیوز اور ڈاکٹر متی عقراوی نے اپنی کتاب ''التربیة فی الشرق الغربی'' میں اسرائیلی نسل کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے کہا ہے ''فلسطین کے اسرائیلی مدارس میں سب سے اہم اور قابل توجہ چیز یہ ہے کہ انگریزی، فرانسیسی اور عربی زبانوں کی تعلیم کے علاوہ تمام مضامین میں ذریعۂ تعلیم عبرانی ہے اور تعلیم کے تمام مراحل میں مذہبی تعلیم اور اس کو صہیونیت کی بقا وترقی کی بنیاد بنانے پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کے سابق صدر ''موشے کٹساؤ'' نے بڑے کھلے اطمینان کا اظہار کیا ہے، جسے امریکہ میں مقیم ایک عرب عیسائی مصنف ''سٹیون سلائیٹا'' نے اپنی کتاب ''Anti Arab Racism in the USA'' کے صفحہ ۳۹ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے ''رات کو اسرائیلی ایک پرسکون نیند لیتے ہوں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ان کی نصابی کتابیں اپنا کام خوب کر رہی ہیں۔''

ماہنامہ ''فلسطین'' میں ''اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم'' کے عنوان سے مقالہ نگار نے ایک رپورٹ میں اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ''اعلیٰ تعلیم میں جو سیاست کارفرما ہے، اس کا اصل مقصد یہودی عقیدہ کی ترویج واشاعت، اس کے ساتھ محبت وتعلق میں اضافہ، ساتھ ہی اسرائیل کے لیے پروپیگنڈہ اور اس کے لیے دوستوں کی تلاش ہے۔''

اسرائیل میں مذہبی تعلیم کا، جسے ہمارے روشن خیال، سیکولر اور لبرل دانشور بنیاد پرستی سے تعبیر کرتے ہیں، کا اس شدت سے اہتمام کیا جاتا ہے کہ اس کا اندازہ آپ یہودی مصنفین اسرائیل شحاک اور نارٹن میزونسکی کی مشترکہ کتاب ''اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی'' کے

اقتباسات سے لگا سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ’’اسرائیل کے تعلیمی اداروں میں طلبہ کے لیے یہودیوں کی بنیادی مذہبی کتاب ’’تالمود‘‘ کا مطالعہ لازمی ہے، نیز تعلیمی حکام طلبہ کو یہ ہدایات ضرور دیں کہ عبادت کرنے، خیرات دینے اور دوسرے نیک کام کرنے کی بجائے تالمود کا مطالعہ ان کے لیے جنت میں داخلے کے لیے زیادہ بہتر ہے اور جو طلبہ تالمود کے مطالعے میں منہمک ہوتے ہیں، وہ خود اپنے، اپنے خاندان، اپنے مالی معاونین اور دوسرے یہودیوں کے لیے بھی کس حد تک جنت میں داخلے کا ذریعہ بنتے ہیں۔‘‘ اسی کتاب میں صفحہ ۱۷۹ پر اس انتہا کی ’’بنیاد پرستی‘‘ کا ثبوت دیا گیا ہے جس کی نظیر شاید آپ کو دوسرے مذاہب کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ موصوف لکھتے ہیں: ’’اسرائیل کے قیام کے چند سالوں بعد ہی اول درجے کو اسکولوں کی ریاضی کی کتابوں سے جمع کا نشان (+ جو عیسائیوں کی صلیب کے مشابہ ہے) ختم کر کے اس کی جگہ (T) کا نشان لگایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جمع کا نشان یہودی بچوں کے مذہبی اعتبار سے بگاڑ کا سبب بن سکتا ہے۔ اسرائیل تعلیمی حکام نے ’’پروٹوکولز‘‘ کی ’’سولہویں دستاویز‘‘ میں اس عزم کا اظہار بھی کیا ہے ’’جب ہماری حکومت قائم ہوگی تو سب سے پہلے ہم یونیورسٹیوں کی تعلیم از سرنو مرتب کریں گے۔ اس مقصد کے لیے ایک خفیہ پروگرام کے تحت جامعات کے اساتذہ کو بھی فکری تربیت دی جائے گی اور نصاب سے ایسے تمام مضامین خارج کر دیے جائیں گے جو ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کے باعث بن سکتے ہوں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ غیر یہودی عوام کو ایسا فرمانبردار وحشی جانور بنا دیا جائے جو خود سوچنے اور سمجھنے سے عاری ہو۔‘‘

اس کے برعکس ہم مسلمانوں نے تعلیم و تربیت کے اصولوں کو معاشرے اور زندگی سے الگ کر کے اسے بے جوڑ معلومات کو نسل در نسل منتقل کرنے کا ایک بے جان آلہ قرار دے رکھا ہے، جس میں باہم مربوط کرنے والی وحدت اور امت کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کی صلاحیت موجود ہی نہیں ہے اور یہی ہماری سب سے بڑی اور بنیادی غلطی یا غلط فہمی ہے۔

انتہائی تکلیف دہ بات یہ ہے کہ وہ ملک جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا یہاں بھی بیسیوں نظام تعلیم نئی نسل کے افکار و نظریات کو منتشر کرنے اور انہیں ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں کرنے کا فریضہ بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ شومئ قسمت سے ہم پون صدی سے کسی ایک نظام تعلیم پر متفق نہیں ہو پا رہے: کہیں پر آکسفورڈ کے نصاب سے نئی نسل کے

ذہنوں کو پراگندہ کیا جارہا ہے تو کہیں پر کیمبرج کے نام پر اخلاقیات کی دھجیاں اُڑائی جارہی ہیں اور جن سرکاری یا نجی اشاعتی اداروں کی کتابوں میں جہاں کہیں تاریخ اسلام، سیرت نبوی، سیرت صحابہ، جہاد سے متعلق مختلف سورتیں اور احادیث، تحریک آزادی، تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت، پاکستان کی آزادی کی تحریک اور اس کے علاوہ نامور اور ممتاز مسلمان لیڈر اور سپہ سالاروں کا تذکرہ موجود تھا، اُسے بھی رفتہ رفتہ ختم کر کے موجودہ گندی سیاست کے دھوکے باز سیاسی رہنماؤں اور پارٹی لیڈروں کے تذکرے کو شامل کرلیا گیا ہے۔

بے شک ہمیں مختلف علوم وفنون اور نظام ہائے تعلیم وتربیت کے نظریات، چاہے وہ مغرب کے ساختہ پرداختہ ہوں یا مشرق کے پروردہ، ان سے استفادہ کرنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں چاہیے کہ انہیں اپنی تمام تفصیلات وجزئیات کے ساتھ انسانی علوم کی معراج، منتہائے کمال اور حرفِ آخر تصور نہ کریں بلکہ ان تمام علوم وفنون اور نظام ہائے تعلیم وتربیت کے ساتھ خام مال کا سا معاملہ کریں اور اس کو مقامی اثرات، وقتی مصالح، الحاد اور اخلاقی اقدار کی تضحیک اور ہر قسم کے فساد سے پاک کریں۔

اس غیر فطری صورت حال سے چھٹکارا پانے اور اس وسیع ذہنی، فکری اور نظریاتی خلیج کو، جس میں جدید تعلیمی نظام کا ہمیشہ سے مرکزی کردار رہا ہے، ختم کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اس پورے نظام تعلیم کو یکسر تبدیل کیا جائے اور از سرنو ایک نیا نظام تعلیم متعارف کیا جائے جو مشرق ومغرب کے سیاسی اثرات اور مصالح ومفادات سے آزاد ہو، جو امت مسلمہ کے اجتماعی مفادات، ضروریات، رجحانات اور عقیدہ وتہذیب سے ہم آہنگ ہو اور اس کے قدو قامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی ودنیاوی ضروریات پوری کرسکتا ہو۔ یہ کام اگرچہ انتہائی دقیق، پیچیدہ اور سنگ گراں ہے اور اس کے نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہوں گے لیکن مغرب کی ذہنی غلامی کا خول توڑنے، روشن خیالی اور آزادخیالی کے بھنور سے نکلنے، تجدد پسندی کے آگے بند باندھنے اور مغرب سے آنے والے ہر طوفان کو روکنے کا واحد راستہ ہے۔ آج کے اس جدید دور میں یہ امت مسلمہ کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔

دینی مدارس کی تعلیم		مدیر

مدرسہ ڈسکورسز

یہ دینی مدارس کی اصلاح کے نام پر مغربی سرپرستی میں ان کے بگاڑ کا ایک میگا پراجیکٹ ہے
دینی مدارس توجہ فرمائیں

ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے مدرسہ ڈسکورسز کا جو علمی تعاقب کیا اس میں دوسرے لوگ بھی شامل ہوتے گئے اور حال ہی میں ڈاکٹر ابصار احمد، سید خالد جامعی، محترمہ عامرہ احسان وغیرھم کی وقیع تحریریں اس سلسلے میں سامنے آئی ہیں۔

ہم ایک دفعہ پھر کہتے ہیں کہ دینی مدارس کے نظام ونصاب میں کئی چیزیں اصلاح طلب ہیں۔ اہل مدارس کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیے اور جو لوگ اس اصلاح کے لیے کچھ عملی اقدامات کر سکتے ہوں انہیں وہ بھی کرنے چاہئیں اور دینی تعلیم کے ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جو ان خامیوں سے پاک ہوں۔

لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو 'علمی ترفع' اور 'علمی ترقی' کے نام پر امریکہ کی ایک مشنری مسیحی یونیورسٹی کے زیر انتظام متجدد ومشرک اساتذہ کے حوالے کر دیا جائے جو ان کی استعماری مقاصد کے لیے برین واشنگ کریں۔ یہ ظلم ہے اور ہم اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے رہیں گے۔

ہم اگر یہ نہ بھی کہیں کہ دینی مدارس کی ماڈرنائیزیشن (انہیں جدید بنانے) اور مین سٹریمنگ (انہیں تعلیم کے مرکزی دھدے میں شامل کرنے) کے نام پر ہماری فوج اور حکومت جن اقدامات کی کوشش کر رہی ہے وہ مغربی دباؤ کا نتیجہ ہیں، تو بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ اقدامات مخدوش ہیں۔ اس سلسلے میں صحیح طرز عمل یہ ہے کہ دینی مدارس کے علماء کو جمع کر کے ان کے سامنے عصری تقاضے اور تجاویز رکھی جائیں اور پھر انہیں موقع دیا جائے کہ وہ خود اپنے نظام ونصاب میں ضروری اصلاحات کا کریں۔

ہم باصرار کہتے ہیں کہ دینی مدارس کی اصلاح کے ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم جدید

عصری تعلیم کی اصلاح ہے۔ اسے اسلام ونظریۂ پاکستان کے مطابق بنانا ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ جدید تعلیم موجود صورت میں لامحالہ مغرب زدہ ہے، مغربی تعلیم کا چربہ ہے اور مغرب کی فکری وعلمی بنیادوں پر استوار ہونے کی وجہ سے اسلام کا مطلوب فرد تیار کرنے میں رکاوٹ ہے کیونکہ مغربی فکر وتہذیب اسلام سے مختلف ومتضاد ہے اور اس کی علمبردار قوتوں کا اسلام اور مسلم دشمن ہونا ہم دوصدیوں سے بھگت رہے ہیں۔ ان حالات میں دینی مدارس کو مجبور کرنا کہ وہ موجودہ مغرب زدہ عصری تعلیم کو اپنالیں، ان میں نہ صرف فساد پھیلائے گا بلکہ انہیں بتدریج غیر موثر بنائے گا اور پھر خدا نہ کرے ایسا وقت بھی آئے کہ دینی مدارس بھی مغربی فکر وتہذیب کے فروغ کے مرکز بن جائیں جس طرح کہ اس وقت دینی جماعتوں اور تحریکوں کے افراد کے قائم کردہ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں بدقسمتی سے اسلام کی بجائے مغربی فکر وتہذیب کے فروغ کے لیے کام کررہی ہیں اور قرآن کا انسان مطلوب پیدا کرنے کی بجائے مغرب کو درکار آدمی تیار کررہی ہیں۔

مدرسہ ڈسکورسز کے نام پر نوٹرے ڈم کی امریکی مشنری مسیحی یونیورسٹی کو پاکستان اور ہندوستان کے دینی مدارس میں تبدیلی لانے کے لیے (مغربی نقطۂ نظر سے مفید تبدیلی لانے اور اسلامی نقطۂ نظر سے مدارس کو برباد کرنے) کے لیے پہلے دو متجددین پروفیسر ابراہیم موسیٰ اور ڈاکٹر مہان مرزا کی صورت میں ملے جنہیں دینی مدارس میں تبدیلی لانے کے لیے چینج ایجنٹس کی ضرورت تھی جو انہیں دو متجددین (پاکستان میں جاوید غامدی کے شاگرد ڈاکٹر عمار ناصر اور بھارت میں ڈاکٹر مظہر وارثی[1]) کی صورت میں ملے۔ اب یہ دونوں متجدد حضرات دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء پر کام کررہے ہیں اور انہیں نوٹرے ڈم یونیورسٹی کی مدد سے متجدد بنارہے ہیں اور یہ امریکی تربیت یافتہ علماء جب دینی مدارس میں جاکر کام کریں گے تو لامحالہ مدارس کے نظام میں فساد پھیلائیں گے۔ آج ایک عمار ناصر اور ایک مفتی زاہد ہیں، کل بیسیوں اور پرسوں سیکڑوں مفتی زاہد اور عمار ناصر ہوں گے جو ہمارے دینی مدارس میں مغرب کی اسکیم کے تحت تبدیلی لانے کے لیے سرگرم ہوں گے۔ اس سے دینی مدارس کا اسلامی کردار بتدریج

[1] بدقسمتی سے دونوں دیوبند کے دینی مدارس کی پیداوار ہیں

غیر موثر ہوتا چلا جائے گا اور یہی مغرب کو مطلوب ہے۔

اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے طریقے صرف دو ہیں: ایک یہ کہ دینی مدارس اپنے نظام ونصاب پر خود نظر ثانی کریں اور اپنی مرضی سے جو تبدیلیاں مناسب سمجھیں، لائیں۔ دوسرے یہ کہ نوٹرے ڈم، عمار ناصر اور مظہر وارثی کی متجددانہ سرگرمیوں کی واضح الفاظ میں مذمت کریں اور اس میں مداہنت سے کام نہ لیں۔ اور جو لوگ ان کے اعوان وانصار ہیں، وہ ان کی بھی مذمت کریں تاکہ دینی مدارس کے علماء وطلبا میں ایک عمومی آگاہی پیدا ہو جائے کہ انہوں نے ان متجددین کی سرگرمیوں سے بچنا ہے اور ان سے تعاون نہیں کرنا۔ ان کی سرگرمیاں دوانہیں داء ہیں۔ یہ اصلاح نہیں فساد پر مبنی ہیں اور یہ برصغیر کے دینی مدارس کو غیر موثر بنانے، انہیں اشاعت دین کے موثر راستے سے ہٹانے اور انہیں جدید اور مغرب زدہ بنا کر انہیں ناکام بنانے کا مغربی منصوبہ ہے۔ ہمارا کام دینی مدارس کو خبردار کرنا تھا سو کر رہے ہیں۔

قارئین توجہ فرمائیں!

۱۔ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں راقم کو فوراً مطلع کریں۔

۲۔ سالانہ زراعانت کی تجدید کروائیں نیز وہ احباب جن کو پرچہ اعزازی طور پر ملتا ہے، وہ خوشحال ہیں اور ۵۰۰ روپے کا سالانہ زراعانت آسانی سے ادا کر سکتے ہیں وہ زراعانت جمع کروائیں۔

۳۔ اگر آپ پرچہ جاری نہیں رکھنا چاہتے تو بھی مطلع فرمائیں۔

۴۔ مکتبہ البرہان کی کتابوں کی خریداری کے لیے رابطہ فرمائیں۔

حافظ محسن یوسف (سرکولیشن انچارج)
0309-4607124
موبی کیش نمبر: 0306-4640366

تعلیم و تربیت

خواجہ مظہر صدیقی

تربیتِ اولاد کے دو اہم اصول

والدین بچوں کو ذاتی توجہ اور وقت دیں۔ یہ بات سادہ لیکن بہت اہم ہے اور ہمارے اکثر والدین اسے اہمیت نہیں دیتے

چند روز پہلے فیصل آباد کے ایک نجی سکول میں سالانہ ’یوم والدین‘ کے موقع پر میرا تربیت اولاد کے عنوان پر سیشن تھا۔ اس تقریب میں کچھ بچوں اور والدین کو ایوارڈز بھی دیے گئے۔ ایک دراز قد، بظاہران پڑھ خاتون کو" سال کی بہترین ماں" کا ایوارڈ دیا گیا۔

سیشن کے اختتام پر میں نے ایوارڈ حاصل کرنے والی ماں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔لیکن وہ سکول میں پڑھنے والے تینوں بچوں کو لے کر اپنے گھر واپس چلی گئی تھیں۔ میں نے پرنسپل صاحب سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر آپ کو اس خاتون کا گھر معلوم ہو تو میں آپ کے ساتھ جا کر کچھ دیر کے لیے اس ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔

پرنسپل صاحب مجھے سکول سے بہت دور محلہ غلام آباد لے گئے۔ وہاں ایک معمولی سا گھر تھا۔ جو ایک کمرے پر ہی مشتمل تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ اور اتنا ہی صحن تھا۔ بچے اور ان کی ماں گھر میں موجود تھے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بچوں کا والد ایک فیکٹری میں مزدوری کرتا ہے۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ ماں گھر میں رہ کر سلائی مشین پر لوگوں کے کپڑے سیتی ہے۔ اپنی محنت کی کمائی سے وہ بچوں کی سکول فیس ادا کرتی ہے۔ یہ صرف ماں کا ہی شوق تھا کہ بچے شہر کے اچھے سکول میں پڑھ رہے تھے۔سکول انتظامیہ نے بچوں کے شوق اور تعلیمی رجحان کو دیکھ کر کچھ فیس کم بھی کر دی تھی۔

میں نے پرنسپل صاحب کی اجازت سے اس خاتون سے پوچھا کہ آپ کو سال کی بہترین ماں کا ایوارڈ ملا ہے۔ اس ایوارڈ ملنے پر آپ کیا محسوس کر رہی ہیں؟ وہ خاتون پر جوش اور پر اعتماد انداز میں بولیں، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ پچھلے سال بھی مجھے ہی یہ ایوارڈ ملا تھا۔ کیوں کہ میرے بچے سکول سے ناغہ نہیں کرتے، صاف ستھری یونیفارم میں سکول جاتے ہیں۔ ان کی لکھائی بہت خوب صورت ہے، ان کا ہوم ورک مکمل ہوتا ہے۔ یاد کرنے کا سبق بھی ٹھیک طرح سے یاد کر کے جاتے ہیں اور تینوں بچے ہر سال امتحانات میں فرسٹ پوزیشن بھی لیتے

ہیں۔ خاتون کے بچے بالترتیب چھٹی، پانچویں اور چوتھی جماعت میں زیر تعلیم تھے۔

میں نے پوچھا، کیا بچے سکول کے بعد اکیڈمی پڑھنے جاتے ہیں؟، وہ خاتون جھٹ سے بولی۔ نہیں، میں نے انہیں کبھی کسی اکیڈمی میں نہیں بھیجا۔ میں ان پڑھ ہوں لیکن میں نے دو اصولوں کو اپنی زندگی کا لازمہ بنالیا ہے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ میں گھر کے تمام ضروری اور بنیادی کام کپڑے دھونا، صفائی، کھانا پکانا، سلائی مشین پر کپڑے سینا اس وقت کرتی ہوں جب بچے سو رہے ہوں یا سکول گئے ہوں یا عصر کے بعد گراؤنڈ میں کھیلنے کے لیے گئے ہوں۔ میں اس دوران میں ہی سارے کام نمٹا لیتی ہوں۔ جب میرے بچے گھر آتے ہیں تو میں اپنی پوری توجہ ان کو دیتی ہوں۔ اس وقت گھر کا کوئی کام نہیں کرتی۔ میرے بچے ہوتے ہیں یا میں ان کا سایہ بن کر ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوں۔

میں بڑی توجہ سے سادہ پنجابی لہجے کی اردو میں اس خاتون کی باتیں سن رہا تھا، جب وہ لمحے بھر کو رکیں تو میں نے پوچھا دوسرا اصول بھی بتادیں۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پہ سجاتے ہوئے بولیں، **میرا دوسرا اصول** یہ ہے کہ جیسے ہی میرے بچے مغرب کی نماز سے فارغ ہوتے ہیں۔ میں فرش پر چٹائی بچھا کر بیٹھ جاتی ہوں اور انہیں کہتی ہوں کہ اپنے اپنے سکول کے بستے لے آؤ۔ پھر میں ان میں سے ہر ایک سے اس کا سکول میں پڑھا جانے والا سبق سنتی ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔ لیکن میرے بچے سمجھتے ہیں کہ میں پڑھی لکھی ہوں اور سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ میں ہر مضمون کا سبق تین بار پڑھنے کا کہتی ہوں۔ بچے سناتے ہوئے یاد کر لیتے ہیں۔ روز کا سبق روز یاد کرنے سے بچے امتحانات کے دنوں میں پریشان بھی نہیں ہوتے۔ انہیں پوری کتاب یاد ہو چکی ہوتی ہے۔ مغرب سے عشاء تک بچے بلا ناغہ میرے پاس بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ میں بھی روز کچھ نیا سیکھتی ہوں۔ اور میرے دل کو تسلی بھی ہو جاتی ہے کہ میرے تینوں بیٹوں نے اپنا سبق دہرا کر اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیا ہے۔

بات ختم ہو چکی تھی۔ میں وہاں سے واپس آتے ہوئے رستے میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک ان پڑھ ماں اپنے بچوں کو ملک وقوم کی خدمت کے لیے کس انداز میں تیار کر رہی تھی۔ وہ قابل تعریف ماں ہے۔ یقیناً یہی بچے ہمارے مستقبل کے معمار بنیں گے۔

تزکیۂ نفس

محمد موسیٰ بھٹو[۱]

تزکیۂ نفس نہ ہونے سے معاشرے کی تباہی

مغرب کی مادی فکر جو لوگ بھگ تین سو سال سے پیش ہو رہی ہے، اس فکر کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ مسلمانوں کے بیشتر طبقات کو اس فکر نے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ تزکیہ کا کام جو دین کے نصب العینی کام کی حیثیت رکھتا ہے، وہ ہماری فکر میں ثانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے یا عملی طور پر اس کی حیثیت ثانوی ہوگئی ہے۔ تزکیہ کے کام کو نہ تو سیاسی دینی حلقے اہمیت دینے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی دینی اصلاحی حلقے اس کام کو حقیقی کام سمجھتے ہیں۔

عدم تزکیہ کے نقصان دہ اثرات

تزکیہ کے اس کام سے بے نیازی کا نتیجہ ہے کہ معاشرہ تیزی سے نفس پرستی اور مادیت کی طوفانی لہروں کی نذر ہو گیا ہے۔ ہماری سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی زندگی بے شمار مسائل ومصائب کا شکار ہوگئی ہے۔ تزکیہ دراصل انسان کے نفسانی وجود پر روحانی قوتوں کو غالب کرنے، اسلام کی پاکیزہ اخلاقی قدروں سے بہرہ وری اور فیضیابی کا نام ہے۔

جب کسی معاشرے کا قابل ذکر حد تک تزکیہ ہو جاتا ہے، وہ اخلاقی اور روحانی طور پر مستحکم ہو جاتا ہے تو وہ اتحاد و وحدت کے رشتہ سے منسلک ہو جاتا ہے۔ اس کا پاکیزہ اخلاقیات پر مشتمل اجتماعی نظام انسانیت کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور مادیت اور نفس پرستی کی بے رحم طاقتوں کی شکار انسانی پاکیزہ اخلاقیات سے بہرہ ور ملت کو اپنا آئیڈیل سمجھ کر، اس کے نظام زندگی کو اپنانے کے لیے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگتی ہے۔

تزکیہ سے دوری کی وجہ سے مسلمانوں کے اجتماعی شیرازہ کا بکھر جانا

تزکیہ جو دین کا نصب العینی کام ہے، اس سے دوری کی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی شیرازہ بکھر چکا ہے۔ دنیا واہل دنیا کی نظروں میں مسلمانوں کا رعب ختم ہو کر، ان کو ذہنی غلام

[۱] مدیر ماہنامہ 'بیداری' حیدر آباد

بنانے اور اپنی مادہ پرست تہذیب کا حصہ بنانے کی دوڑ آخری مرحلے میں پہنچ چکی ہے۔

تزکیہ سے دوری کا گروہ بندی کو جنم دینا

تزکیہ سے دوری کا لازمی نتیجہ مادی دنیا سے محبت کرنے، مادی مفادات کو ترجیح دینے، مفادات کی بنیاد پر گروہ بندی کو مستحکم کرنے اور ایک دوسرے سے تصادم کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔ جب اسکولوں وکالجوں سے تزکیے کے خانے کو سرے سے ہی نکال دیا گیا ہو، دینی مدارس بھی تزکیہ کے کام کو اپنے نصاب کا حصہ بنانے کے لیے تیار نہ ہوں، دینی وسیاسی جماعتوں کا نظام کی تبدیلی کا کام اوڑھنا بچھونا بن چکا ہو تو اس طرح کی صورتحال میں معاشرے میں تزکیہ کے کام کے لیے فکرمندی اور اس کی ضرورت واہمیت کا احساس کیسے اُجاگر ہوسکتا ہے؟ چنانچہ علم اور دین کے حوالے سے نظام کی تبدیلی کا سارا کام تزکیہ میں معاون ثابت ہونے کے بجائے تزکیہ سے دوری کا ذریعہ بن جاتا ہے جس سے معاشرہ اخلاقی طور پر کھوکھلا ہوجاتا ہے اور معاشرے میں مادہ پرستی کی دعوتوں سے متاثر ہونے کے زہریلے اثرات پوری طرح غالب رہتے ہیں۔

مادیت کی تحریک کی طرف سے مسلمانوں پر قیامت ڈھانا

اس نکتہ کی مزید تفصیل یہ ہے کہ مادیت پرستی کی تحریک اور اس کے مادی فکر نے مسلمانوں پر جو قیامت ڈھائی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر طبقہ کے افراد معاشرہ سے تزکیہ کی اہمیت کے احساس کو سلب کردیا ہے۔ نیز اس نے ہمارے صدیوں کے تربیتی نظام (جو خانقاہی صورت میں موجود تھا) اس پر اعتماد کو متزلزل کرکے، جدید افراد اور خود مذہبی افراد کو تزکیہ اور خانقاہی نظم سے دور کردیا ہے۔ اس طرح ہمارے خانقاہی نظام پر کاری ضرب لگائی گئی ہے اور نفس پرستی اور مادہ پرستی کی قوتوں کے سامنے بند باندھنے کی صورتیں مسدود ہوگئی ہیں۔

خواہشات کے طوفان کا اودھم مچانا

خواہشات کے طوفان نے وہ اودھم مچایا ہے کہ ہماری انفرادی واجتماعی زندگی افراتفری کا شکار ہوگئی ہے اور عقل وہوش کی بات سننے کی فضا ختم ہوگئی ہے۔

سارے اداروں کی افراد کو تزکیہ سے دور کرنے کی روش

جب ہمارے اسکول اور کالج معاشرے کو نفس پرست افراد فراہم کریں گے، ہمارے دینی مدارس معاشرے کو تزکیہ سے خالی محض وعظ ونصیحت کی باتیں کرنے والے افراد مہیا کریں

گے، ہماری دینی سیاسی جماعتیں محض سیاسی تبدیلی کے حامل افراد تیار کریں گی، جو دین کے نام پر خارجی جدوجہد ہی کو دین کا نصب العین سمجھیں گے تو معاشرے کا یہ حال نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟

علم اور تزکیہ کے جداگانہ اثرات

جدید مادی فکر کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ علم کی تحصیل سے عام طور پر ظاہری تبدیلی واقع ہوتی ہے، نیز اس سے عقل متاثر ہوتی ہے جبکہ تزکیہ کے لیے مجاہدوں سے باطن کی وسیع دنیا میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور پاکیزہ روحانی واخلاقی قدروں سے بہرہ وری کی صورت پیدا ہوتی ہے اور ذاتی مفادات سے نجات کی صورت پیدا ہو کر، اخلاص، للّٰہیت، بے نفسی اور مفادات سے بلندی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ جدیدیت نے علم اور تزکیہ کی ان جداگانہ خصوصیات کے فہم کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔

علم کو تزکیہ کے مقصد میں معاون ثابت ہونا چاہیے، نہ کہ دوری کا موجب۔ علم اس وقت غیر معمولی طور پر نافع ثابت ہوتا ہے جب فرد تزکیہ کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

جہادی سرگرمیوں میں شمولیت

یہ بجا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے اپنے دور میں جہادی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا ہے اور وقت کے فتنوں کا بھی مقابلہ کیا ہے۔ ہندستان میں انگریز کے غلبہ کے دور میں اور ان کے غلبہ سے نجات کے لیے کوششوں میں ہمارے بزرگوں نے کردار ادا کیا ہے لیکن ایک تو وہ عقل وعقلیت پر مشتمل اپنے دور کے فکر سے متاثر نہیں ہوئے، دوسرے یہ کہ انہوں نے ہر دور میں تزکیہ کے کام کو نصب العینی اہمیت دی اور اپنی بیشتر صلاحیتیں معاشرے میں تزکیہ کے لیے فضا ہموار کرنے کی سرگرمیوں میں صَرف کیں۔ سوم یہ کہ انہوں نے جہادی سرگرمیوں کو دین کے ایک فریضہ کی حیثیت سے ادا کیا۔ جونہی یہ وقتی وہنگامی فریضے کی ضرورت باقی نہ رہی، وہ دعوت واصلاح وتزکیہ کے کام میں ہمہ جہتی مصروف ہو گئے۔

موجودہ دور میں مسلم اہل علم پر جدیدیت کے اثرات

موجودہ دور میں جدیدیت کی فکر نے بیشتر مسلم اہل علم اور مفکرین کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ باطن کی وسیع دنیا اور تزکیہ کے کام کی نصب العینی اہمیت سے بے خبری کی وجہ سے خارجی

جدوجہد ہی کو دین کا نصب العین قرار دینے لگے، جس کا نتیجہ ہے کہ معاشرے کو طاقتور اخلاقی وروحانی صلاحیتوں کے حامل افراد ملنا بند ہوگئے، جو معاشرے کو اخلاقی وروحانی طور پر سنبھالنے کا کردار ادا کرتے۔ اس طرح معاشرہ اخلاقی اور روحانی طور پر بانجھ ہوگیا۔ شہروں اور قصبوں میں گھوم جائیے، حقیقی اہل اللہ کی خانقاہیں ویرانی کا منظر پیش کررہی ہیں اس لیے کہ افرادِ معاشرہ سے تزکیہ اور روحانی بالیدگی کی طلب ہی ختم ہوگئی ہے۔ البتہ مادی مقاصد کے لیے جعلی بزرگوں اور عاملوں کی بھرمار ہے۔ چونکہ افرادِ معاشرہ کو ایسے عاملوں اور ایسے جعلی پیروں کی ضرورت ہے، اس لیے وہ وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔

قرآن میں تزکیہ کی اہمیت

تزکیہ جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا، قرآن نے اس کو فیصلہ کن اہمیت دی ہے ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰى ﴾ [الاعلیٰ ۸۷: ۱۴] یعنی کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اپنا تزکیہ کیا یعنی اپنے نفس کو پاک کیا۔ دوسری جگہ ہے ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ۙ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ؕ﴾ [الشّمس ۹۱: ۹، ۱۰] یعنی: جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا (یعنی اس کا تزکیہ نہ کیا) وہ خسارے میں رہا۔

قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے چار مقاصد بیان فرمائے گئے ہیں: کتاب کی تعلیم، آیات کی تعلیم، تزکیہ کی تعلیم اور حکمت کی تعلیم۔ بعض علمائے ربانیین نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کتاب کی تعلیم، آیات کی تعلیم اور حکمت کی تعلیم کا مقصد بھی تزکیہ یعنی نفس کی پاکیزگی ہے، اس لیے کہ نفس کی پاکیزگی کے بغیر کتاب وسنت کی تعلیم پر اس کی پوری روح کے ساتھ عمل کرنا دشوار ہوتا ہے۔

قرآن میں ایک جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے آتا ہے ﴿اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۖ فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى ﴾ [النازعات ۷۹: ۱۷، ۱۸] ''فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہوگیا ہے، اسے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا تزکیہ ہو۔''

ان آیات سے تزکیہ کا دین کا بنیادی ترین ادارہ ہونا اور دین کا نصب العین ہونا بالکل واضح ہے جس سے اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار ممکن ہی نہیں۔

فہم اسلام/ڈائیلاگ　　ڈاکٹر محمد امین

اقتدار یا اصلاحِ اقتدار؟

عصرِ حاضر میں اسلام کا سیاسی نظام کیسا ہونا چاہیے؟

پروفیسر قاضی اظہار الحق صاحب کے اٹھائے ہوئے بعض مباحث کا جواب

اسلام کے سیاسی نظام کی تفصیلات کا تعین ایک اجتہادی عمل ہے۔ حالات کے بدلنے سے اجتہادی حکم بدل جاتا ہے لہٰذا ماضی میں اختیار کی گئی سیاسی حکمت عملی کو آج بدلنا شرعی و عقلی تقاضا ہے۔

۱۔　عرصے بعد کسی نے سلیقے سے اختلاف کیا ہے اور ڈھنگ سے اس کے ساتھ تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا ہے۔

۲۔　عصر حاضر میں غلبۂ دین اور دینی تحریکوں کی حکمت عملی چونکہ ہمارا پسندیدہ موضوع ہے لہٰذا ہم اس پر لکھتے رہتے ہیں۔ جس شذرہ کے حوالے سے قاضی ظفر الحق نے قلم اٹھایا ہے، وہ البتہ مختصر تھا اور محض ایک تجویز پر مشتمل تھا، اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو نہ تھی لہٰذا قاضی صاحب نے کئی مباحث ایسے اٹھائے ہیں جو وضاحت طلب ہیں اور جن پر اپنی رائے دینے کا ہمیں ازسرنو موقع ملا ہے۔

سب سے پہلے ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ ہم نے جو یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمارے دینی عناصر غیر صالح مسلم حکمرانوں سے حریفانہ کشمکش ترک کردیں اور دینی مقاصد کے لیے خود برسر اقتدار آنے کی بجائے 'اصلاحِ اقتدار' کا سلف کا منہج اپنالیں تو اس کی فکری اساس کیا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

اجتہادی امر

اس ضمن میں سب سے پہلے تو ہم یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ سیاسی اور دعوتی حکمت عملی کی تفصیلات کا تعین کوئی منصوص چیز نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعین ایک اجتہادی امر ہوتا ہے۔ یہ حکمتِ عملی زمان و مکان اور حالات کے تغیر سے بدلتی رہتی ہے اوا گر اسلام کو تا قیامت قابل عمل رہنا ہے تو یہ بدلتی رہنی چاہیے۔ جن قارئین کے لیے یہ جملے کفایت نہ کریں بلکہ انہیں اس کی تفصیل درکار ہو، تو وہ مندرجہ ذیل حقائق پر غور کریں:

۱۔ علمائے اسلام تفہیم کی خاطر دین کو چار بڑے شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں: عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات ۔ پہلے تین شعبوں کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ کوئی تغیر قبول نہیں کرتے اوران میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑتی۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دائمی اور ناقابل تغیر (Fixed and Permanent) احکام نازل فرمائے ہیں۔'معاملات' کا پہلو البتہ مختلف ہے۔ان کی نوعیت ایسی ہے کہ ان میں تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے۔لہٰذا شارع حکیم نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ ان کے لیے بنیادی پالیسی امور تو نازل فرمادیے لیکن ان کی تفصیلات کا تعین امت کے اہل علم (مجتہدین) پر چھوڑ دیا کہ وہ حسب ضرورت قرآن وسنت کی نصوص اور مقاصد کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہوئے ان تفصیلات کا تعین خود کرلیں۔

۲۔ اسلام میں اجتہاد کا دائرہ کار، مسلم علمیات (Epistemoloy) کے حوالے سے دو بڑے امور تک محدود ہے:

ایک: علوم نقلیہ میں نصوص قرآن وسنت کے مفہوم کا تعین اور عملی زندگی پر ان کا اطلاق یعنی Implementation۔

دوسرے: علوم عقلیہ یا قرآن حکیم کے الفاظ کی رعایت سے علوم حِکمیہ ، ان کی تین اقسام ہیں: علوم آلیہ،علوم عمرانیہ اور سائنسی علوم۔علوم آلیہ سے مراد وہ علوم ہیں جو فہم نصوص میں ہماری مدد کرتے ہیں جیسے فہم قرآن وسنت میں عربی زبان کے معاون ہونے کی وجہ سے اس کی گرامر اور املاء کے اصول وضع کرنا،حدیث میں روایت اور درایت کے اصول وغیرہ۔ یہ پہلے سے موجود نہ تھے بلکہ مسلمانوں نے اجتہاد وتحقیق سے ایجاد کیے۔

سائنسی علوم (جیسے ریاضی، الجبراء، کیمسٹری اور ٹیکنالوجی وغیرہ) یہ خالص عقلی علوم ہیں اور شارع نے انہیں ہدایت کا موضوع نہیں بنایا اور انہیں انسانوں کے حسّی علم، ان کی فراست اور تجربے پر چھوڑ دیا۔اس کی مثال زراعت میں تابیر نخل کا واقعہ ہے کہ جب آپ ﷺ کی تجویز پر عمل کرنے سے فصل اچھی نہ ہوئی اور انصاری کاشتکاروں نے آکر آپ ﷺ کو یہ بات بتائی تو آپ نے فرمایا کہ اگر ہدایت طلبی کا معاملہ ہو تو مجھ سے رجوع کرو ورنہ ایسے دنیاوی امور تم خود بہتر سمجھتے ہو۔ [۱]

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، رقم الحدیث: ۲۳۶۳

عمرانی علوم (جیسے معاشیات، سیاسیات، تعلیم، قانون وغیرہ) کا معاملہ البتہ مختلف ہے۔ ان کا تقریباً نصف مبنی بر نص ہے اور باقی نصف شارع حکیم نے امت کے اہل علم (مجتہدین) پر چھوڑ دیا کہ وہ ان تعلیمات اور ان کے مقاصد کی روشنی میں اجتہاد و تحقیق سے کام لے کر ان کا تفصیلی نظام وضع کر لیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ سیاسی امور میں مشاورت، مساوات، عدل وغیرہ منصوص ہیں لیکن مزید تفصیلات جیسے انتقال اقتدار کا طریقہ کیا ہو؟ اختیارات ایک شخص میں مرتکز ہوں یا کئی اشخاص اور اداروں میں؟ شوریٰ کا طریق کار کیا ہو؟ ان جیسے امور شارع حکیم نے عمداً طے نہیں فرمائے بلکہ انہیں امت کے اہل علم پر چھوڑ دیا کہ نصوص کی روشنی میں اور عقل و فراست و تجربے سے ان کی تفصیلات اجتہاداً خود طے کر لیں۔

۳۔ اجتہاد کے مذکورہ منہاج پر عمل نہایت ضروری ہے کیونکہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اجتہاد کا دروازہ کھولا ہی اس لیے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی اور اسلام کو قیامت تک کے لیے آخری دین قرار دے دیا تو اب اس دین کے ہمیشہ کے لیے قابل عمل رہنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تغیر پذیر امور میں اجتہاد جاری رہے ورنہ اسلام کا ہمیشہ کے لیے قابل عمل ہونے اور رہنے کا دعویٰ غلط ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بوقت ضرورت (عدم وحی کی صورت میں) اجتہاد فرماتے تھے بلکہ آپ نے صحابہ کرام کو اس کی تلقین کی، ترغیب دی بلکہ عملاً ان کی اس کے لیے تربیت کی اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا کہ جو اجتہاد کرے اور صحیح فیصلے پر پہنچے اس کے لیے دہرا ثواب ہے اور جو اجتہاد کرے اور غلطی کرے (یعنی بعد میں ثابت ہو کہ اجتہاد صحیح نہیں تھا) تو اس کے لیے اکہرا اجر ہے [۱] کہ اس نے صحیح رُخ میں کوشش تو کی۔

۴۔ وہ فکری، علمی اور فقہی جمود جو قرونِ متاخرہ میں عدم اجتہاد کے رجحان کا سبب بنا اور اہل دانش کی نظر میں مسلم زوال کی ایک بنیادی وجہ بنا، اس کے متعدد اسباب ہیں مثلاً فقہ تقدیری، متاخر علماء میں تقلید اعمیٰ کا رجحان، فرقہ واریت اور مسلک پرستی، فقہ و فقہاء اور اجتہاد کی تقدیس و تکبیر (جیسے اجتہاد کی اقسام وضع کرنا مثلاً مجتہد مطلق، مجتہد فی المذہب، اصحاب الترجیح والتخریج وغیرہ اور فقہ کو قرآن و سنت کے ساتھ علوم نقلیہ میں شمار کرنا بلکہ خود قرآن و سنت

---

[۱] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي القَاضِي يُصِيبُ وَيُخْطِئُ، رقم الحدیث: ۱۳۲۶

کی تشریح فقہی موقف اور ترجیحات کی بنیاد پر کرنا) جس کے نتیجے میں اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی باتیں کی گئیں اور یہ سمجھا جانے لگا کہ اب تو کوئی مجتہد ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتہاد کے لیے اہلیت مطلوب اور شرائط درکار ہیں اور اس شخص کو اجتہاد کا حق نہیں ہونا چاہیے جو علوم دین میں رسوخ نہ رکھتا ہو اور اس کی حقانیت پر یکسو نہ ہو (اور دین ماسوا اللہ مثلاً مغربی تہذیب یا ہندومت سے متاثر ہو)۔ اس ضمن میں جو شرائط جمہور اہل علم نے کتب اصول فقہ میں ذکر کی ہیں وہ صحیح ہیں.... لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ اجتہاد کیا بھی جائے تو 'اجتہاد' کے لفظ کے ساتھ جو رعب اور تقدیس وابستہ ہوگئی ہے اس کی بناء پر اسے اجتہاد نہ کہا جائے۔

اجتہاد کی نوعیت درحقیقت قرآن وسنت کی روشنی میں ایک مسلمان عالم کی اعلیٰ تحقیقی سرگرمی (Innovative and Creative Research Activity) کی ہے جس کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ نہ ایسی ہر تحقیقی سرگرمی کو اصطلاحاً ''اجتہاد'' کہنا ضروری ہے اور نہ ایسے محقق کو ''مجتہد'' اور نہ کسی کو اس کے لیے ''اجتہاد'' کا دعویٰ کرنے ضرورت ہے۔ ایسی استنباطی، اکتشافی، وضعی اور تحقیقی سرگرمی جس کے نتائج کو عامۃ المسلمین اور اہل علم قبول کرلیں وہ قابل قبول اجتہاد ہے اور جو ایسا نہ ہو وہ انفرادی تحقیقی سرگرمی ہے۔

جس طرح علمی وفکری جمود غلط ہے اسی طرح بدعت وتجدد بھی غلط ہے اور اعتدال اور وسطیت ہی اس ضمن میں بہتر راستہ ہے۔

اس وضاحت سے مقصود یہ کہنا تھا کہ منصوص سیاسی تعلیمات کی روشنی میں ماضی کے اہل علم نے جو سیاسی حکمت عملی اختیار کی وہ ایک نوع کا اجتہادی عمل تھا اور حکم اجتہادی چونکہ حالات اور علت کے بدل جانے سے بدل جاتا ہے اس لیے بدلے ہوئے حالات میں سیاسی حکمت عملی کا بدل جانا عین شرعی اور عقلی ہے۔ اس ضمن میں اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے ہمیں اجتہاد کے تین بڑے دائرے یا اسالیب نظر آتے ہیں جو یہ ہیں:

سیاسی حکمت عملی کے حوالے سے پہلا اجتہاد

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد جب بعض صحابہ کرام نے نظام حکومت میں خرابیاں دیکھیں تو پہلے حضرت حسین بن علیؓ نے اور بعد میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کی

اصلاح کے لیے مسلح جدوجہد کی کوشش کی لیکن یہ دونوں بزرگ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی عزیز تھے اور امت کے گُل سرسبد تھے، مظلومانہ شہید ہوگئے۔ یہ دھچکا اتنا بڑا تھا کہ اس کے مابعد اثرات (After Shocks) آج بھی محسوس ہوتے ہیں۔

حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے خروج کے منہج کو ہم اجتہادی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس وقت حضرت معاویہؓ کے جانشین کی بیعت عامہ ہوچکی تھی اور بیعت خاصہ کے لحاظ سے دیکھیے تو اہل الحل والعقد بشمول کئی صحابہ کرام بھی بیعت کر چکے تھے لہٰذا پچھلی قانونی حکومت سے (اور وہ اس لیے قانونی تھی کہ امیر المومنین حضرت حسن بن علیؓ ، حضرت معاویہؓ کے حق میں خود کو Withdraw کر کے حضرت معاویہؓ کی بیعت کر چکے تھے اور امت اس اتحاد کو 'عام الجماعۃ' قرار دے کر خوشی سے اسے قبول کر چکی تھی) سے نئی حکومت کو پرامن طریقے سے اقتدار منتقل ہوچکا تھا اور قانونی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا اجتہادی موقف یہ تھا کہ حکمران غیر صالح ہیں اور نظام حکومت میں اتنی (غیر اسلامی) خرابیاں پیدا ہوچکی ہیں کہ احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رو سے خروج جائز ہے۔ لیکن یہ دونوں بزرگ اپنی جلالت نسبی وعلمی کے باوجود عملاً اپنی سیاسی جدوجہد میں کامیاب نہ ہوسکے اور نہ نظام حکومت میں ہونے والا غیر صالح تغیر رُک سکا اور نہ حکومت بدل سکی.... گو ان کی عزیمت وعظمت اور مظلومانہ شہادت وشجاعت اظہارِ حق کا دائمی استعارہ بن گئی۔

سیاسی حکمت علمی پر دوسرا اجتہاد

حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی اندوہناک شہادت کے اثرات ونتائج میں سے ایک یہ بھی تھا کہ امت کے سربرآوردہ اہل علم وصلاح نے 'خروج' کے حوالے سے نیا اجتہاد کیا اور انہوں نے مسلح قوت سے غیر صالح مسلم حکمرانوں کو ہٹانے اور ان کی جگہ صالح تر حکمران لانے کی بجائے پرامن اصلاح اقتدار کی روش اپنائی۔ نیز انہوں نے اپنی جدوجہد کا محور 'تعلیم کتاب وحکمت اور 'تزکیۂ نفس' کو بنالیا اور فقہی امور میں امت کی رہنمائی اور قضاء کے کام کو اپنا لیا۔ اوّل الذکر کام نے بتدریج دینی مدارس، دوسرے نے تزکیہ وتصوف اور خانقاہی نظام اور تیسرے نے فقہ وافتاء کے اداروں کی شکل اختیار کرلی۔ پہلے تینوں کام دینی

عناصر نے پرائیویٹ سیکٹر میں عوام اور حکمران طبقوں کی معاونت سے منظم کیے جب کہ چوتھا کام (قضاء کا) حکومتوں سے مل کر کیا۔

اجتہادی نکتہ اس میں یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے غیر صالح مسلم حکمرانوں کے خلاف مسلح جدوجہد (خروج) کے لیے دو شرطوں کا ذکر کیا تھا: ایک ارتکاب کبائر اور دوسرے کفر بواح[۱]۔ اس نقطۂ نظر کے حامل علماء کرام نے واضح کیا کہ آپ ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ تھا کہ یہ دو شرطیں پائی جائیں تو خروج کیا جا سکتا ہے، نہ کہ کرنا ضروری ہے۔ یہ کیا صرف اس وقت جائے جب اس کی کامیابی کا حتمی یقین ہو تا کہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے غیر صالح مسلم حکمرانوں کا حریف بننے اور انہیں قوت سے معزول کرنے کی بجائے سسٹم کے اندر رہ کر پرامن کوششوں سے ان کی اور نظام حکومت کی اصلاح کی روش اپنائی۔ بعض اہل علم اس اجتہادی روش پر اجماع کا ذکر کرتے ہیں[۲] اور بعض کے نزدیک یہ جمہور کی یعنی علماء اسلام کی اکثریتی رائے تھی۔[۳]

اس اجتہادی رائے کو امت نے بالعموم قبول کر لیا اور اگلے تیرہ سو سال تک امت نے اسی پر عمل کیا اور بعض حکمرانوں کے ظلم و جور یا ان کی بدعنوانیوں اور بداعمالیوں کے باوجود امت کے علماء، فقہاء، مفسرین، محدثین، صوفیاء میں سے کسی نے جماعت سازی، جتھہ بندی اور خروج کی کوشش نہیں کی بلکہ پرامن انداز میں اہل اقتدار اور ان کی حکومتوں کی اصلاح جاری رکھی یہاں تک کہ کمال اتاترک اور اس کے ساتھیوں نے غالب الحادی مغربی فکر و تہذیب سے متاثر و مرعوب ہو کر ۱۹۲۴ء میں اس 'خلافت' کا خاتمہ کر دیا۔

اس منہج کا فائدہ یہ ہوا کہ بارہ سو سال تک امت بڑی حد تک متحد رہی، اسے سیاسی استحکام میسر رہا اور معاشرہ و ریاست بڑی حد تک دین پر قائم رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، رقم الحدیث: ۴۸۰۰

[۲] امام نوویؒ، قاضی عیاضؒ، ابوالحسن اشعریؒ، ابن بطال اور ابوبکر بن مجاہد وغیرھم نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

[۳] امام طحاویؒ نے اسے امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کا، ابن المفلح الحنبلی نے امام احمد بن حنبلؒ کا، ابو عثمان صابونی نے سلف صالحین اور محدثین کا، امام تفتازانیؒ نے سلف کا اور امام سرخسیؒ و علامہ شامیؒ نے احناف کا یہی موقف قرار دیا ہے جبکہ ابن تیمیہؒ کی اور مالکیہ و شوافع کی اشعری ہونے کی بناء پر یہی رائے ہے۔

دوران مسلم سیاسی نظام میں خرابیاں بھی پیدا ہوئیں۔ خلافت میرٹ کی بجائے وراثت میں منتقل ہوگئی، بیت المال کا غلط استعمال ہوا، بیعت خاصہ وعامہ کی شکل برقرار رہی لیکن یہ روح سے محروم ہوگئی، انتقال اقتدار کا کوئی منہج جڑ نہ پکڑ سکا، بعض اوقات ظلم وجبر کے حالات بھی پیدا ہوئے، ''خلافت'' خلفاء راشدین کے منہج سے ہٹ کر برائے نام خلافت رہ گئی اور بعض اوقات آمریت میں بھی تبدیل ہوگئی اور یقیناً سیاسی نظام گروتھ اور ڈویلپمنٹ سے محروم رہا۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مسلمان زوال کا شکار ہوئے تو اس کا تجزیہ کرنے والے اہل علم میں سے کئی ایک نے اس برائے نام خلافت اور ملوکیت کو بھی مسلم زوال کا ایک سبب قرار دیا جیسا کہ اقبال نے کہا ہے کہ ؂ اے کُشتۂ ملّائی وسلطانی وپیری۔

سیاسی حکمت عملی کے حوالے سے تیسرا اجتہاد

سیاسی حکمت عملی کے حوالے سے تیسرا بڑا اجتہاد ہمیں تنسیخ خلافت کے بعد نظر آتا ہے۔ خلافت مغرب زدہ مسلمان ترک فوجیوں کے ایک گروپ نے خود ختم کردی۔ اس کے بعد فاتح یورپی قوموں نے سارے عالم اسلام پر قبضہ کرکے انہیں غلام بنالیا اور وہاں اجتماعی زندگی کے سارے ڈھانچوں (سیاسی، معاشی، تعلیمی، قانونی....) کو منہدم کرکے اپنی فکروتہذیب کے مطابق ان کی تشکیل نو کی مثلاً انہوں نے اپنا جو سیاسی نظام مسلمان ملکوں میں رائج کیا وہ جمہوریت کہلاتا تھا اور اس میں انتقال اقتدار پُرامن طریقے سے ہوتا تھا چنانچہ نئی دینی سیاسی جماعتوں (الاخوان المسلمون وغیرہ) کے قائدین نے سوچا کہ ہم اقتدار کی بجائے اصلاح اقتدار کے پرانے اجتہادی فارمولے سے کیوں چمٹے رہیں جب کہ حالات بدل گئے ہیں اور خلافت کا وہ سیاسی نظام ہی باقی ہی نہیں رہا جس کی بقاء اور استحکام کی خاطر اسلاف نے وہ منہج اختیار کیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اجتہاداً یہ طے کیا کہ وہ (یعنی علماء کرام اور دینی عناصر) غیر صالح مسلم حکمرانوں سے حریفانہ کشمکش کرکے انہیں اقتدار سے معزول کرنے اور دینی مقاصد کے لیے خود ان کی جگہ لینے کے لیے پرامن سیاسی جدوجہد کریں گے۔

اس اجتہاد کی ناکامی اور اس کے اسباب

فقہ واصول فقہ اور اسلام کے نظام سیاست ودعوت کے ایک طالب علم کی حیثیت سے

ہماری رائے یہ ہے کہ اب چوتھے اجتہاد کی ضرورت ہے کیونکہ تیسرا اجتہاد عملاً ناکام ثابت ہو چکا ہے اور جن مقاصد شرعیہ کے حصول کے لیے وہ کیا گیا تھا وہ اس سے حاصل نہیں ہو سکے۔ اس ادعا کی تفصیل یہ ہے:

ناکامی: تیسرے اجتہاد میں جدید دینی تحریکوں کے قائدین اور علماء نے خود سیاسی جدوجہد میں براہ راست حصہ لے کر اور غیر صالح مسلم حکمرانوں سے حریفانہ کشمکش کے ذریعے حصول اقتدار کی جتنی بھی کوششیں گزشتہ تقریباً ایک صدی میں کیں ان میں وہ ناکام ہو گئے۔ نہ وہ کہیں صحیح اور مضبوط اسلامی ریاست قائم کر سکے اور نہ وہاں کے سیاسی نظام کو مطابقِ اسلام بنا کر اس پر عمل درآمد کر سکے بلکہ الٹا اسلام مخالف مغربی تہذیب کے اصول و اقدار مسلم معاشرے اور ریاست پر غالب آ گئے ہیں۔ [۱]

ناکامی کے فکری اسباب

- یہ یاد رکھیے کہ عملی ناکامی کے اسباب عموماً فکری ہوتے ہیں کیونکہ اعمال کی محرک فکر ہی ہوتی ہے اور جیسی فکر ہوتی ہے عموماً ویسے ہی اعمال وجود میں آتے ہیں لہٰذا اگر تیسرا اجتہاد ناکام ہوا ہے تو اس کے بنیادی اسباب بھی فکری ہیں، جو ہماری رائے میں درج ذیل ہیں:

- ہر اجتہادی فکر درحقیقت ان تحدیات (چیلنجز) کا جواب فراہم کرتی ہے جو اس وقت مسلم معاشرے کو درپیش ہوتے ہیں لیکن یہ ایک انسانی کاوش ہوتی ہے اور شعوری کوشش کے باوجود بعض اوقات مصلح، مفکر، مجدد، مجتہد، محقق اس گرداب کے اثرات سے بالاتر ہو کر نہیں سوچ سکتا جس میں معاشرہ پھنسا ہوتا ہے۔ اس تیسرے اجتہاد کے وقت مسلم مفکرین کو دو چیلنجز درپیش تھے: ایک مسلم زوال سے سبق سیکھنے کا اور دوسرے مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کا۔ ان دونوں چیلنجز کے جو جواب اس تیسرے اجتہاد کے علمبردار مسلم علماء و مفکرین نے دیے وہ علمی اور فکری لحاظ سے متوازن نہ تھے جس کی تفصیل یہ ہے:

- پہلے چیلنج کے جواب میں جدید دینی سیاسی تحریکوں کے قائدین نے مسلم زوال کے تین اسباب کی نشاندہی کی: فکری جمود۔ غلط تصوف اور خلافت کا ملوکیت میں بدل جانا۔ یہ

---

[۱] ایران ایک استثنیٰ ہے لیکن وہاں کامیابی انقلاب یعنی عوامی مزاحمت کے ذریعے ہوئی نہ کہ مذکورہ اجتہادی فارمولے کے تحت۔

تشخیص اصولاً غلط نہ تھی لیکن انہوں نے مسائل کا جس طرح تجزیہ کیا اور ان کا جو علاج انہوں نے تجویز کیا اس میں ان سے مبالغہ ہوگیا اور انہوں نے انتہاء کا جواب دوسری انتہاء سے دیا جس کی وجہ سے وہ راہ اعتدال پر قائم نہ رہ سکے مثلاً فکری جمود بلاشبہ موجود تھا اور لوگ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی باتیں کر رہے تھے لیکن اس کے جواب میں انہوں نے جس حریت فکری کی وکالت کی وہ یہ تھی کہ اللہ اور رسول کے سوا کوئی تنقید سے بالاتر نہیں اور اس طرح انہوں نے اقوال صحابہ وتابعین، اجماع مجتہدین اور جمہور علماء وجمہور امت کو وہ اہمیت نہ دی جس کے وہ مستحق تھے۔

تصوف خصوصاً متاخرین کے تصوف میں بلاشبہ بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئیں تھیں اور بہت سے غیر اسلامی افکار اور غیر اسلامی رسوم ورواج اس میں داخل ہو گئے تھے لیکن اس کا حل یہ نہیں تھا کہ تصوف کی بالکلیہ تغلیط کر دی جاتی اور امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی اصلاحی کوششوں کی تردید کرتے ہوئے اسے علاج (دوا) کی بجائے بیماری (داء) قرار دیا جاتا جس سے دین میں تزکیۂ نفس کی اہمیت ہی ختم ہو کر رہ گئی۔

اسی طرح پچھلے تیرہ سو سال میں خلافت وشورائیت علی منہاج النبوہ اور علمی منہاج خلفائے راشدین بلاشبہ باقی نہیں رہی تھی لیکن اس کا یہ مطلب کب تھا کہ اس کے لیے حضرت عثمانؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کو مطعون کیا جاتا اور اسلامی تاریخ کے سارے دین دار حاکموں کی نفی کرتے ہوئے اسلام کی سیاسی تاریخ کے سنہری حروف پر کالا برش پھیر دیا جاتا اور مغرب کی جمہوری کامیابی کو دیکھتے ہوئے یہ اعلان کر دیا جاتا کہ تیرہ سو سالہ مسلم خلافت ملوکیت کے سوا کچھ نہ تھی۔

دوسرا فکری تسامح اس اجتہاد کے علمبرداروں سے یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے موقف کی صحت پر اصرار کرتے ہوئے جو دلائل دیے اور اسے شرعی استناد مہیا کرنے کے لیے جو صغریٰ کبریٰ جوڑا اور اپنے موقف کو جس طرح Philosophize کیا اس سے یہ تاثر ابھرا کہ وہ دین کی ایک نئی تعبیر کر رہے ہیں اور دین کے نصب العین کا از سر نو تعین کر رہے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے انہوں نے جزء کو کُل قرار دے دیا یعنی سیاست جو دین کا سولھواں حصہ تھی (دین کے چار شعبے ہیں: ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات۔ گویا معاملات دین کا

چوتھا حصہ ہیں۔آگے معاملات کے کئی شعبے ہیں جیسے معاشیات،مناکحات،نفسیات،فقہیات، سیاسیات .....وغیرہ۔تو سیاسیات گویا معاملات کا چوتھا حصہ ہے اور دین کا سولھواں) لیکن جدید دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین نے اپنی سیاسی حکمت عملی کو اقامت دین،حکومت الٰہیہ، اسلامی نظام حیات اور اسلامی انقلاب کا نام دے کر گویا پورا دین قرار دے دیا۔اسے بعض دانشور اسلام کی سیاست کاری (یعنی Politicization of Islam) کہتے ہیں۔ویسے بھی سیاسی جماعت بنانا اور دین کی خاطر اقتدار کے لیے جدوجہد کرنا کسی نص سے ثابت نہیں اور نہ کسی نے آج تک اسے حکم شرعی کہا ہے بلکہ اس کی شرعی بنیاد دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی ہے اور جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں کہ تبلیغ اور امر بالمعروف فرض کفایہ ہیں فرض عین نہیں ہیں اور دین کے بہت سے احکام میں سے ایک حکم ہیں لہٰذا جزو دین ہیں نہ کہ پورا دین۔

تیسرے فکری تسامح کا تعلق مسلم امہ کو درپیش دوسرے چیلنج سے تھا۔ ہماری مراد مغربی فکروتہذیب کے غلبے سے ہے۔ بلاشبہ جدید دینی تحریکوں کے قائدین نے اس چیلنج کا بھی ادراک کیا اور ان میں سے بعض نے اس کے خلاف سوچا اور لکھا بھی اور مغربی فکروتہذیب پر مبنی تعلیمی اداروں سے تعلیم وتربیت پانے والے افراد، جو اس فکروتہذیب سے مرعوب ومتاثر تھے اُنھوں نے اِنہیں اس ابلیسی تہذیب کے چنگل سے نکالنے کی کوشش بھی کی۔لیکن اگر ہم دقّت نظر سے دیکھیں تو جان جائیں گے کہ:

- ان کا مضبوط اسلامی ریاست کے قیام کے تصور کو عین دین اور دین کا نصب العین قرار دینا درحقیقت ایک ردّعمل تھا مغربی تہذیب کے غلبے کا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام صرف انفرادی زندگی کا علمبردار نہیں بلکہ اجتماعی زندگی (یعنی اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست) کا بھی علمبردار ہے اور ان کا قیام بھی (بشرط استطاعت) فرض قرار دیتا ہے۔ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اگر مسلمان اتنی تعداد میں ہوں یا اتنی طاقت رکھتے ہوں کہ وہ اسلامی معاشرہ اور ریاست قائم کر سکتے ہوں تو انہیں ضرور قائم کرنی چاہیے۔

- دوسری بات یہ کہ انھوں نے اسلام اور مغربی فکروتہذیب میں تلفیق اور مفاہمت (Reconciliation) قبول کرلی اور مغرب کے سیاسی نظام ''جمہوریت'' اور اسلامی

شورائیت کے مرکب کو''اسلامی جمہوریت'' قرار دے دیا۔ یہ فکری رویہ مغربی فکر وتہذیب کے غلبے کو قبول کرنے کے مترادف ہے بلکہ اس سے مرعوبیت کا غماز ہے کیونکہ جو آدمی اسلام کو سمجھتا ہے اور جس نے مغربی فکر وتہذیب کے بنیادی تشکیلی عناصر (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم....) کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ مغرب کا ورلڈ ویو (تصور انسان، تصور کائنات اور تصور الٰہ) کلیتاً غیر اسلامی ہے اور توحید، رسالت، آخرت کا نقیض ہے اور ان دو متضاد اور متناقض نظریات کو جمع نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان میں تلفیق اور مفاہمت ممکن ہے اور مزید یہ کہ کوئی باحمیت اور عاقل مسلمان اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار ممالک (امریکہ ویورپ وغیرہ) اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، تو کیسے مغربی فکر وتہذیب کو اسلامی نقطہ سے قابل قبول قرار دیا جاسکتا ہے اور کیسے مغربی جمہوریت کو مسلمان قبول کرسکتے ہیں اور کیسے مغربی جمہوریت اور اسلامی شورائیت کو جمع کر کے انہیں''اسلامی جمہوریت'' قرار دیا جاسکتا ہے اور اسے اسلامی انقلاب کا منہج بنایا جاسکتا ہے؟

مندرجہ بالا چاروں فکری نکات کے علمبردار جدید دینی سیاسی تحریکوں کے قائدین ہیں اور ان کا تیار کردہ وسیع لٹریچر اس پر شاہد ہے اور ضرورت ہو تو اس کی تفصیل سے نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔

فکری تسامحات کا نتیجہ۔ناکامی

ان فکری تسامحات کا نتیجہ اس اجتہادکی اور ان تحریکوں کی ناکامی کی صورت میں نکلا اور اس نتیجے کا نکلنا ہماری رائے میں بالکل فطری، منطقی اور لابدی تھا اور ہے بلکہ اس کا کوئی اور نتیجہ نکل سکنا ممکن ہی نہ تھا کیونکہ یہ علت ومعلول (Cause and Effect) کے اصول کا تقاضا تھا اور ہے۔ اگر آپ دوڑیں گے تو سانس پھولے گا۔ اگر آپ کھانا کھائیں گے تو پیٹ بھرے گا وقِس علی ذلک۔

مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ ان چاروں فکری تسامحات کے دو نتائج نکلے:

پہلا نتیجہ: پہلے چیلنج (زوال امت کے اسباب) کے حوالے سے جن دو فکری تسامحات کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روایتی علماء اور ان کی جماعتوں اور اداروں اور عامۃ

المسلمین نے ان جدید دینی تحریکوں کے افکار اور ان کے تصور دین کو ردّ کر دیا۔ ان میں اور جدید دینی تحریکوں کے زعماء میں شدید فکری کشمکش برپا ہوئی جس کے نتیجے میں یہ تحریکیں اصلاحی تحریکیں بن کر رہ گئیں، امت کی نمائندہ تحریکیں نہ بن سکیں اور روایتی علماء اور عامۃ المسلمین نے ان جدید دینی تحریکوں کی عمومی اور خصوصاً سیاسی حمایت کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں مثلاً پاکستان میں جدید اسلامی تحریک کبھی بھی انتخابات میں کامیاب نہ ہوسکی بلکہ پاکستان میں اس کا ووٹ بنک لاکھوں اور ہزاروں سے گرتا ہوا اب چند سو ووٹوں تک پہنچ گیا ہے۔ مصر میں مسلسل تعذیب سہنے کی وجہ سے اگرچہ الاخوان المسلمون کو ہمدردی کا ووٹ ملا اور وہ انتخابات جیت گئے لیکن یہ بات بھولنے کی نہیں کہ مرسی کی معزولی میں ساری دیگر دینی جماعتیں اخوان کے خلاف تھیں۔ اور اخوان پر جب بھی ابتلا کا وقت آیا، انہوں نے خود ہی بھگتا اور قوم اور دیگر دینی قوتیں کبھی ان کے حق میں نہیں اٹھیں۔

مسلم معاشرے میں جدید دینی تحریکوں کی ناکامی کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ دوسرے سیاسی اجتہاد کے وقت چونکہ اہل علم وفضل نے تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس پر ترکیز کی تھی اس لیے خلافت کے سیاسی نظام کے پوری طرح صحیح کام نہ کرنے کے باوجود، معاشرہ خیر پر اور اسلامی اصول واقدار پر قائم رہا اور مسلم تہذیب ۱۲ سو سال تک دنیا پر غالب رہی۔ لیکن جب تیسرے اجتہاد میں جدید دینی سیاسی جماعتوں نے آئیڈیل اسلامی ریاست کے قیام کے لیے خود (غیر صالح مسلم حکمرانوں سے حریفانہ کشمکش کرتے ہوئے) براہ راست سیاسی انتخابی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنے نظریے کو Philosophize کرنے کے لیے دین اور دینی تصورات کی ایسی تشریح کی کہ آئیڈیل اسلامی ریاست کا قیام ہی بنیادی دینی تقاضا اور دین کا نصب العین لگنے لگا تو تعلیم کتاب وحکمت وتزکیۂ نفس کا بنیادی کام ان کے ہاں منطقی طور پر غیر اہم ہوتا چلا گیا۔ اس کے نتیجے میں انہیں ایک طرف سیاسی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو دوسری طرف دینی تعلیم وتربیت نہ ہونے کی وجہ سے اس روحانی اخلاقی بحران نے جنم لیا جس سے مسلم امہ اور خصوصاً پاکستانی معاشرہ اس وقت دوچار ہے۔

دوسرا نتیجہ: دوسرے چیلنج (مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ) کے بارے میں جدید دینی تحریکوں کے جن دو تسامحات کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی تہذیب کے

علمبر دار ممالک نے مسلم ممالک میں ان جدید اسلامی تحریکوں کو ناکام بنانے کے لیے ہر طرح کا جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈا کیا، ان کو ناکام بنانے کے لیے ہر طرح کی سازشیں کیں، دوسری دینی قوتوں کو ان کے خلاف منظم کیا اور اُنہیں اِن سے لڑایا، مسلم حکمرانوں (نیز فوج اور عدلیہ) کو مجبور کیا کہ وہ ریاستی قوت سے ان دینی تحریکوں کو کچل دیں اور انہیں بہرصورت ناکام بنائیں اور انہوں نے ان جماعتوں کو ناکام بنا کر جذباتی نوجوانوں کو پرتشدد تحریکوں پر ابھارا۔ پھر قوت سے ان کو کچلا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی اور انتہا پسندی کا جھوٹا اور زہریلا پروپیگنڈا کیا۔

مغرب کے اسلام و مسلم دشمن رویے کا یہ ایک رُخ تھا۔ اس کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ اس نے جدید دینی تحریکوں کو اندر سے فکری لحاظ سے سبوتاژ کیا اور ان کے اندر مغربیت کو قبول کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح مسلم مفکرین مغرب کے ردّ عمل کا شکار ہو کر ''اسلام ہماری سیاست ہے اور سیاست ہمارا دین ہے'' جیسے نعرے لگانے لگے۔ انہوں نے اپنی ساری توانائیاں سیاسی جدوجہد میں لگا دیں جس میں انہیں مغرب نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ پھر انہیں تعلیم و تزکیہ اور تعمیر فرد پر توجہ نہ کرنے دی جس سے مسلمان دین سے دور ہوتے چلے گئے اور مسلمان معاشرے روحانی اور اخلاقی بحران سے دوچار ہو گئے اور مسلم ممالک میں شریعت نافذ ہونے کی بجائے سیکولرزم، لبرل ازم اور مادہ پرستانہ اصول و اقدار غالب آ گئے۔ مغرب نے مسلم مفکرین کو اسلام کی طرف لوٹنے اور اسلامی اداروں کی تشکیل نو کی بجائے انہیں مغربی فکر و تہذیب سے مفاہمت (Reconciliation) کی راہ دکھائی اور انہوں نے سیاست میں مغربی جمہوریت کو ''اسلامی جمہوریت'' میں ڈھال کر اور مغرب کے سودی معاشی نظام کو ''اسلامی بنکنگ'' میں ڈھال کر اور مغربی نظام تعلیم میں اسلامیات کے ایک مریل سے مضمون کے اضافے کے بعد انہیں ''اسلامی سکول'' قرار دینے اور ان کے لیے قابل قبول بنانے میں مدد کی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی فکر و تہذیب کے علمبر دار ممالک کی حیثیت، اسلام اور مسلم دشمنی کے حوالے سے، دومنہ والے سانپ کی سی ہے کہ وہ اِدھر سے بھی ڈستا ہے اور اُدھر سے بھی ڈستا ہے۔ اس نے جدید اسلامی تحریکوں کو داخل سے بھی ڈسا اور خارج سے بھی ڈسا اور ان کو ناکام بنا کر دم لیا۔

بعض لوگ ان فکری تسامحات پر جدید دینی تحریکوں کے مصلحین و مفکرین پر تجدد اور گمراہی

کا الزام لگاتے ہیں جو ہماری رائے میں صحیح نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم سطور بالا میں وہ حدیث نبوی پیش کر چکے ہیں کہ اگر فقیہ و عالم اجتہاد کرے اور وہ صحیح ثابت ہو تو اس کے لیے دہرا اجر ہے اور اگر اس کا اجتہاد صحیح ثابت نہ ہو تو بھی اس کے لیے اکہرا اجر ہے کیونکہ اس نے ایک کارِ خیر کے لیے کوشش تو کی۔

سیاسی حکمت عملی کے حوالے سے چوتھا نیا اجتہاد ناگزیر ہے

اہل علم جانتے ہیں کہ نئے اجتہاد کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کوئی نیا معاملہ درپیش ہو یا حالات بدل جائیں یا سابقہ اجتہاد جس مسئلے کے حل کے لیے کیا گیا تھا، وہ مسئلہ حل نہ ہوا ہو۔ اس معاملے میں حالات تو نہیں بدلے البتہ سطور بالا کے مختصر تجزیے سے واضح ہے کہ تفصیلی سیاسی حکمت عملی کے حوالے سے تیسرا اجتہاد ناکام ہو چکا ہے اور اس سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوئے جو اس کے پیش نظر تھے لہٰذا نیا اجتہاد ناگزیر ہو چکا ہے۔ نئی سیاسی حکمت عملی کے خطوط کیا ہونے چاہئیں؟ اہل علم و دانش کے غور و فکر کے لیے ہم اپنی طالب علمانہ رائے یہاں قلم بند کرتے ہیں۔

ہمارے بنیادی فکری مسائل آج بھی وہی دو ہیں جن کا ذکر ہم نے تیسرے اجتہاد کے ضمن میں کیا تھا یعنی مغربی فکر و تہذیب کی بالادستی کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونا اور مسلمانوں کے زوال سے سبق سیکھنا۔ فرق صرف یہ ہے کہ تیسرے اجتہاد نے ان کا جو حل تجویز کیا تھا، ہماری رائے میں وہ ناکام ہو چکا ہے اور اب ہمیں ایک نئے حل کی طرف بڑھنا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اس ضمن میں اپنی طالب علمانہ تجاویز پیش کریں ہم اپنے قارئین کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ جو دینی جماعتیں اور عناصر اس وقت تیسرے اجتہاد کے مطابق کام کر رہے ہیں، ہماری تجاویز ان کو نئی، غیر مانوس بلکہ فضول اور احمقانہ لگیں گی لیکن ہمیں یقین ہے کہ جو لوگ شخصی اور اندھی تقلید کے قائل نہیں اور غور و فکر کی صلاحیت رکھتے ہیں انہیں تدبر و تفکر کے نتیجے میں بتدریج ہماری تجاویز میں وزن نظر آنے لگے گا، ان شاء اللہ۔ ہماری تجاویز کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ مغربی فکر و تہذیب ملحدانہ اور کافرانہ ہے، اس کو ردّ کر دینا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کے الفاظ میں یہ شراب کی طرح "داء ہے دوا نہیں"[۱] یعنی یہ بیماری کا علاج نہیں خود بیماری

[۱] سنن ترمذی، کتاب الطب، رقم الحدیث: ۲۰۴۶

ہے۔اس کے علمبردار یہود ونصاریٰ قرآن وسنت کی رو سے اسلام اور مسلم دشمن ہیں اور امت کا مشاہدہ وتجربہ بھی یہی ہے لہٰذا مغربی فکروتہذیب کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ ، مفاہمت اور (Reconciliation) یا ˜ ªl VǬLý 9, DLșÈLý Xµ کا رویہ صحیح نہیں۔ یہ اسلام دشمن فکروتہذیب ہے۔اس کے علمبردار استعماری ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو کچلا، لوٹا، تباہ کیا، غلام بنایا اوران کے اجتماعی اداروں کوگرا کر اپنی فکروتہذیب کے مطابق ان کی تشکیل نو کی۔وہ آج بھی مسلمانوں کو زوال کے گڑھے سے نکلنے نہیں دے رہے اور انہیں دین سے دور کرنے کی اور اپنا فکری وعملی غلام بنائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں لہٰذا ہم ان کے سیکولرازم، ان کے لبرل ازم ، ان کے کیپٹل ازم، ان کی سیاست (وطن پرستی اور جمہوریت)، ان کی معیشت (سودی نظام اور بنکنگ)، ان کی تعلیم (مخلوط تعلیم، تعلیم کو تجارت بنا دینا، تعلیم کے ذریعے الحاد پھیلانا) غرض ان کے Value-Loaded تصورات، اداروں ، اقدار کو ہر گز قبول نہیں کر سکتے۔ ہمیں انہیں بہر حال ردّ کرنا ہوگا۔

۲۔ ہمیں یہ سوچ کر کہ ہمارے ماضی کے سیاسی نظام کی کمزوریوں نے بھی ہمارے زوال میں کردار ادا کیا ہے اور مغرب کی لادین سرمایہ دارانہ جمہوریت (یا اس کے ساتھ مفاہمت والی برائے نام ’اسلامی جمہوریت‘) بھی ہمارے مسائل کا حل نہیں کر سکی اور نہ اس سے معاشرے میں اسلام آسکا ہے اور نہ شریعت نافذ ہوسکی ہے لہٰذا پہلے ہمیں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو کرنا ہوگی اور پھر اسے اپنے ہاں نافذ کرنا ہوگا۔ اس کی تشکیل نو کیسے ہوگی اور اسے نافذ کیسے کیا جائے گا؟ اس پر ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو

اس کی بنیادی پالیسی یہ ہونی چاہیے:

۱۔ سیاست وریاست کے بارے میں قرآن وسنت کی تعلیمات کو سامنے رکھنا۔

۲۔ ماضی میں امت نے ’خلافت‘ کے نام سے جو تجربہ خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار میں کیا، اسے پیش نظر رکھنا۔

۳۔ عصری ضرورتوں، تقاضوں اور مقامی حالات واعراف کا استحضار

۴۔ دیگر اقوام نے جو سیاسی تجربات پچھلی صدیوں میں کیے ہیں انہیں سامنے رکھنا تاکہ ان میں سے جو چیزیں Value-loaded نہ ہوں بلکہ مباحات میں سے ہوں، ان سے محتاط استفادہ کرنا۔

عصر حاضر میں اسلام کے مجوزہ سیاسی نظام کا مذکورہ طرز پر خاکہ یا مسودہ تیار کرنے کے لیے ایسے علماء کرام، دینی علوم میں رسوخ رکھنے والے اسلامی سکالرز اور مغرب کے مقابلے میں اسلام کی فکری وعملی بالادستی پر یقین رکھنے والے وکلا پر مشتمل ایک کمیٹی یا کمشن قائم ہونا چاہیے۔ لازم ہے کہ وہی لوگ یہ کام کریں جو مغربی تہذیب اوراس کے سیاسی نظام سے مرعوب ومتاثر ہوئے بغیر اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو میں یقین رکھتے ہوں۔ جب تک ایسا بااختیار کمشن بنانے پر رضامند حکومت وجود میں نہیں آتی، امام ابوحنیفہؒ والی فقہی کمیٹی، اوآئی سی کے مجمع الفقہ الاسلامی یا بھارت کی فقہ اکیڈمی کی طرز پر یہ کام پرائیویٹ سیکٹر میں بھی ابتداءً ہوسکتا ہے۔

اسلام کے مجوزہ سیاسی نظام کا نفاذ

مغربی جمہوریت اور (اسلام ومغربی جمہوریت کے مرکب پر مبنی) 'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے اسلام نہیں آسکا اور نہیں آسکتا۔ مغربی جمہوریت کے ذریعے اس لیے نہیں آسکتا کہ اس کے خالقوں نے اسے اس مقصد کے لیے بنایا ہی نہیں اور جہاں تک 'اسلامی جمہوریت' کا تعلق ہے تو مغرب کی لادین جمہوریت اور اسلامی شورائیت میں تلفیق ممکن ہی نہیں۔ یہ عقل ومنطق کی رو سے محال ہے اور قیاس مع الفارق ہے کیونکہ دونوں کا مصدر، مقاصد اور منہاج ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ پھر تقریباً ایک صدی کے تجربے نے ثابت کردیا ہے کہ اس کے نتیجے میں مسلم معاشرے اور ریاست میں مغربی تہذیب (خصوصا سیکولرزم، لبرل ازم، مادہ پرستی، بھوک، ننگ، عریانی، فحاشی) آئی ہے اسلام اور اس کی اقدار نہیں آئیں لہٰذا مسلم ممالک میں اسلام کے سیاسی نظام کا اجراء ونفاذ ناگزیر ہے۔ لیکن اس پر ملین ڈالر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کی معاصر مسلم ریاست میں (اگر اہل علم اس کا خاکہ اور مسودہ تیار کر بھی لیں) تو اس کا نفاذ کیسے ہوگا اور اسے نافذ کون کرے گا؟ کیونکہ مغربی جمہوریت پر عامل لوگ نہ تو یہ کریں گے اور نہ آسانی سے کرنے دیں گے، لہٰذا ہماری رائے میں اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ سب سے پہلے فرد کی اصلاح، تبدیلی اور تعمیر نو (قرآن کے الفاظ میں تعلیم کتاب وحکمت وتزکیۂ نفس) کا کام کثرت سے پوری قوت سے اور بنیادی کام سمجھ کر کیا جائے۔ ہم اس کی وضاحت کچھ نکات کی صورت میں یوں کریں گے:

❋ ہر دین اور تہذیب [۱] کی بنیاد فرد ہی ہوتا ہے۔ اجتماعی زندگی (معاشرہ اور ریاست) کی بنیاد بھی فرد ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ہر دین، تہذیب سب سے پہلے فرد کی اصلاح کرتی، اس میں تبدیلی لاتی اور اس کی شخصیت کی تعمیر ان اصولوں کے مطابق کرتی ہے جن پر وہ ایمان ویقین رکھتی اور جن کی وہ علمبردار ہوتی ہے۔

❋ قرآن حکیم نے چار دفعہ ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منہاج عمل ''تلاوت وتعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس تھا'' [۲] اور صراحت کرتا ہے کہ پہلے انبیاء کا منہاج عمل بھی یہی تھا [۳]۔ قرآن اس کے لیے دعوت، تعلیم، تبلیغ، اصلاح، انذار، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور تزکیۂ نفس کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ (ہم آئندہ سطور میں ان سب الفاظ کو بار بار استعمال کرنے کی بجائے ان کے لیے 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس' کی اصطلاح ہی استعمال کریں گے)۔

❋ ''تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس'' کا منہاج دین میں اصلاً مطلوب ہے اور یہ دین کا مقصود اور نصب العین ہے اور قرآن کے الفاظ میں اسی پر انسان کی دنیا اور آخرت میں فلاح اور کامیابی کا انحصار ہے [۴]۔ اسلام میں فلاح اور کامیابی کا تصور یہ ہے کہ آدمی دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزارے اور آخرت میں اسے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل ہو [۵]۔ ''تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس'' پر ایک مسلمان کے مسلمان ہونے اور مسلمان رہنے کا انحصار ہے۔ یہ دنیا وآخرت میں کامیابی کی کلید ہے، یہ کوئی سیاسی حکمت عملی نہیں

---

[۱] مغرب کی تہذیب دراصل دین (نظام حیات) ہی ہے لیکن بوجوہ وہ اپنے آپ کو دین (یا مذہب/ ریلیجن) نہیں کہلاتی۔

[۲] البقرہ ۲:۱۲۹، ۱۵۱۔ آل عمران ۳:۱۶۴۔ الجمعہ ۶۲:۲

[۳] الاعلیٰ ۸۷:۱۴۔۱۹، طہٰ ۲۰:۴۴

[۴] الشمس ۹۱:۹، ۱۰

[۵] التوبہ ۹:۸۹

ہے کہ اسے 'اسلامی حکومت' کے قیام کے لیے سیڑھی بنایا جائے۔

❁ اسلام انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کے لیے رہنمائی عطا فرماتا ہے لیکن اگر کسی پیغمبر کی مخاطب قوم کے افراد کی اکثریت اس کی دعوت قبول نہ کرے اور اسلامی معاشرہ و ریاست وجود میں نہ آسکے (جیسا کہ قرآن حکیم اور سنت رسول نے بہت کم ایسے انبیاء کا ذکر کیا ہے جنہیں اقتدار مل سکا) تو بھی وہ پیغمبر کامیاب ہے۔ اسی طرح اگر اسلامی معاشرہ اور ریاست موجود نہ بھی ہو لیکن فرد ممکن حد تک اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے تو وہ ان شاء اللہ آخرت میں کامیاب ہوگا اور دنیا میں بھی اطمینان قلب سے متمتع ہوگا[۱] جو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ جیسا کہ اس وقت امریکہ و یورپ میں مسلمانوں کی صورتِ حال ہے کہ وہ وہاں انتہائی معمولی اقلیت ہیں (ایک یا دو فیصد) ظاہر ہے اس طرح کے کسی ملک کو اسلامی ریاست بنانے کی پلاننگ اور جدوجہد نہ شرعی تقاضا ہے نہ عقلی۔ تاہم جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں یا اتنی بڑی اور طاقتور اقلیت ہوں کہ برسر اقتدار آسکتے ہوں تو ان پر اسلامی معاشرہ اور ریاست کا قیام فرض ہے۔

❁ نبی کریم ﷺ کی دعوتی جدوجہد سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور ان مسلمانوں کی مدد سے آپ ﷺ نے اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم فرمادی۔ مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست تب سے اب تک بلا انقطاع موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کو عدم سے وجود میں نہیں لانا بلکہ موجود اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست میں جو خامیاں اور کمزوریاں پیدا ہوگئی ہیں، ان کی اصلاح کر کے انہیں دور کرنا ہے اور انہیں ایک مثالی اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست میں بدلنا ہے۔

❁ کسی مسلمان کا ذاتی طور پر اقتدار میں آنے کی خواہش رکھنا یا اس کے لیے کوشش کرنا صریحاً غیر اسلامی فعل ہے نبی کریم ﷺ نے صحیح احادیث میں اس سے منع فرمایا ہے[۲] اور خلفاء راشدین میں سے کوئی بھی خلافت کا امیدوار نہ تھا۔ حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت

---

[۱] الرعد ۱۳: ۲۸

[۲] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، رقم الحدیث: ۴۷۱۷

عبداللہ بن زبیرؓ بھی غیر صالح مسلم حکمرانوں اور غیر صالح نظام حکومت کو بدلنا چاہتے تھے، ذاتی طور پر اقتدار کے خواہش مند نہ تھے۔

❁ مسلمانوں کے زوال کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ ان سے ''تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس'' کے اصول پر عمل چھوٹ گیا یا اس میں کوتاہی آ گئی۔

اس وقت بھی مسلمانوں کے زوال سے نکل نہ پانے کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس' کے اصول پر کما حقہ عمل نہیں کر پا رہے اور نہ قرآن کا انسان مطلوب تیار کر رہے ہیں۔ ہماری بعض دینی تحریکوں کی دعوت وتبلیغ پورے دین کی بجائے بعض اجزائے دین پر مشتمل ہے۔ بعض دینی تحریکیں سیاسی جدوجہد پر ترکیز کرتی ہیں اور 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس' کے کام کو کما حقہ اہمیت نہیں دیتیں۔ ہمارا دنیاوی تعلیم کا نظام مغرب کی نقالی پر مبنی ہے اور مسلمانوں کو کافر ومنافق بنا رہا ہے۔ دینی مدارس کا نظام تعلیم بھی ناقص اور جزوی ہے۔ تزکیۂ نفس کے نظام پر قابض دنیا پرست صوفیوں نے تزکیۂ نفس کے قرآنی تصور کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ اور حاصل یہ ہے کہ صحیح خطوط پر فرد کی اصلاح اور متوازن تعمیر شخصیت کا کام ہو ہی نہیں رہا یا بہت کم ہو رہا ہے۔

❁ 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس' کا صحیح نظام اس وقت موجود نہیں ہے۔ وہ ماضی قریب میں بھی موجود نہ تھا اگر ہوتا تو مسلمان زوال پذیر کیوں ہوتے؟ تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے ہمیں اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں بھی یہ کافی حد تک صحیح رہا۔ آج اس کی صحیح اسلامی خطوط پر تشکیل نو کی ضرورت ہے جس کے چند اہم تقاضے (انتہائی اختصار کے ساتھ) درج ذیل ہیں:

۔ نظام تعلیم کی وحدت یعنی مذہبی تعلیم الگ اور دنیاوی تعلیم الگ کے موجودہ نظام کی بجائے ایک موحد (Integrated) نظام تعلیم کا قیام واجراء۔ اس کے لیے نئے نصابات اور نئی نصابی کتب تیار کرنا ہوں گی۔ (مذہبی تعلیم کی بھی اور علوم آلیہ، عمرانی علوم اور سائنسی علوم کی بھی)، تربیت اساتذہ کا نیا منہج تیار کرنا ہوگا اور تعلیمی اداروں کے ماحول کو بدلنا ہوگا۔ تعلیمی اداروں میں تدریس کے علاوہ تربیت وتحقیق اور فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے موجودہ مناہج پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور ان اصولوں پر موجودہ تعلیمی اداروں کی تشکیل نو کرنا ہوگی۔

۔ نظام دعوت کی تشکیل نو کرنا ہوگی۔

۔ تزکیۂ نفس کے لیے نیا منہاج اور نئے تربیتی اداروں کا قیام ناگزیر ہوگا۔

یہ کام حکومتوں کے کرنے کے ہیں لیکن پرائیویٹ سیکٹر میں بھی بڑی حد تک ہو سکتے ہیں۔ دنیا میں ہو رہے ہیں اور کچھ اصلاحی کام پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔

۲۔ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے منہج پر صحیح طریقے سے جان مار کر بیس تیس سال محنت کر لی جائے اور جو افرادی قوت ہاتھ لگے اسے معاشرتی سطح پر منظم کر کے اس سے کام لیا جائے بلکہ یہ کام ساتھ ساتھ کیا جائے تو صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں آتا چلا جائے گا۔ یہ کام خاموشی سے (یعنی بغیر بڑھکیں اور نعرے مارے) اور کسی حکومت سے کشمکش میں الجھے بغیر پرائیویٹ سیکٹر میں کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ دینی عناصر اس وقت بھی کچھ کام کر رہے ہیں لیکن چونکہ صحیح اصولوں پر نہیں کر رہے اس لیے غیر موثر اور عدم نتیجہ خیز ہے مثلاً اس وقت بھی مساجد کا نظام، دینی مدارس کا نظام، کسی حد تک جدید تعلیم کا کام، تزکیہ وتصوف کا کام، تقسیم زکوٰۃ کا کام .... یہ سارے کام اس وقت بھی پاکستانی معاشرے میں پرائیویٹ سیکٹر میں ہو رہے ہیں۔ اگر ان کی صحیح خطوط پر تشکیل نو کر کے انہیں منصوبہ بندی سے کیا جائے تو اسلامی معاشرہ قائم ہوتا چلا جائے گا اور ریاست کا کردار بھی اسلامی سانچے میں ڈھلنا شروع ہو جائے گا۔ اگر اخلاص، فراست، جذبہ اور محنت سے کام کیا جائے تو مذکورہ سارے کام اور بہت سے مزید کام اسی طرح کیے جا سکتے ہیں۔ ہم نے اپنی کئی تحریروں میں اس کی تفصیل دی ہے جیسے مسجد کو مرکز بنا کر:

i۔ فراہمی عدل وانصاف کے لیے ملک بھر میں مصالحتی وثالثی کمیٹیوں کا قیام (جنہیں بعض لوگ شرعی عدالتیں بھی کہتے ہیں) یاد رہے کہ پاکستانی قوانین میں بھی اس کام کی گنجائش موجود ہے۔

ii۔ غربت کے خاتمے اور خدمت خلق کے لیے ہر محلے کی مسجد کی سطح پر رفاہی کمیٹی کا قیام جو محلے کی زکوۃ وصدقات اکٹھی کر کے مقامی یتیموں، بیواؤں اور مساکین کی مالی مدد کرے۔ نیز ملکی سطح پر قوم کے قابل اعتماد نمائندوں پر مشتمل مرکزی زکوٰۃ کونسل بنا کر اربوں روپے اکٹھے کیے جا سکتے ہیں اور انہیں منصوبہ بندی سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ غیر سودی کام کرنے والے تاجروں کو جمع کر کے معاشی استواری کی صورت نکالی جا سکتی ہے کیونکہ پاکستان

میں ۵۰ فیصد سے زیادہ تجارت آج بھی چھوٹے اور درمیانی سطح کے مسلمان تاجر غیر سودی بنیادوں پر کر رہے ہیں۔

iii۔ امن وامان کی بحالی کے لیے نوجوانوں کے گروپ رات کو پہرہ دیں اور دن میں نمازی مسجد جاتے آتے سٹریٹ کرائمز پر نظر رکھیں۔

iv۔ مساجد کو ابتدائی تعلیم کے لیے بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔اس عمر میں بچے کی اگر صحیح اسلامی واخلاقی بنیادوں پر تربیت کر دی جائے تو وہ عمر بھر کا سرمایہ ہے۔دینی مدارس کے علاوہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کو بھی اسلامی بنیادوں پر پرائیویٹ سیکٹر میں منظم کیا جا سکتا ہے۔

❁ اسی میں جواب ہے قاضی ظفر الحق صاحب کے اٹھائے ہوئے اس سوال کا کہ آج کی ریاست کا اقتدار ایک آدمی کے ہاتھ میں نہیں بلکہ عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔سوال یہ ہے کہ ان اداروں کو کون چلاتا ہے؟ ظاہر ہے ان کو افراد ہی چلاتے ہیں۔ہم یہی تو کہہ رہے ہیں کہ ان افراد کی اصلاح کر دی جائے اور ان کو بدل دیا جائے جو ان اداروں کو چلاتے ہیں تو ان اداروں کا کردار خود بخود بدلتا چلا جائے گا۔جب ان اداروں کو چلانے والے افراد ان اداروں کو صحیح اسلامی تعلیمات کے مطابق چلانا چاہیں گے تو ان کا ہاتھ کون پکڑے گا؟ مثلاً اگر مسلمان بیوروکریٹ کی اصلاح ہو جائے تو وہ رشوت نہیں لے گا، لوگوں کو تنگ نہیں کرے گا۔اگر مسلمان جج کی اصلاح ہو جائے تو وہ کوئی فیصلہ قرآن وسنت کے خلاف نہیں دے گا۔اگر مسلمان وکیل کی اصلاح ہو جائے تو وہ کسی مجرم اور ظالم کی وکالت نہیں کرے گا۔اگر کسی مسلمان قانون ساز کی اصلاح ہو جائے تو وہ کوئی قانون خلاف اسلام نہیں بنائے گا وغیرہ وغیرہ۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج ان اداروں میں کام کرنے والوں کی دینی تعلیم وتربیت کا کام کوئی نہیں کر رہا بلکہ اس سے بھی بنیادی اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ کوئی دینی تحریک یا ادارہ افراد کی ایسی تعلیم وتربیت نہیں کر رہا کہ وہ ان اداروں میں جا کر دینی تعلیمات کے مطابق کردار ادا کریں، اپنی داخلی ایمانی قوت کے بل پر اور اس کی وجہ سے۔

❁ یہ کام انہی لوگوں کو کرنا چاہیے جو آج کل کی اصطلاح میں غیر صالح مسلم حکمرانوں کے سیاسی حریف نہ ہوں ورنہ ریاست رکاوٹ ڈالے گی لیکن اگر یہ کام بطور این جی او خاموشی

سے Low Profile میں رہتے ہوئے پرائیویٹ سیکٹر میں کیا جائے تو یہ کام دنیا بھر میں، مغربی ممالک میں اور خود پاکستان میں آج بھی ہو رہے ہیں اور انہیں مزید منظم کیا جا سکتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں حکومتی مدد بھی لی جا سکتی ہے۔

۳۔ ہم نے 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس' کے منہج کے تحت جن اقدامات کا سطور بالا میں ذکر کیا ہے، اگر ان پر کما حقہٗ عمل ہو جائے اور مسلمانوں کی بحیثیت فرد اصلاح ہو جائے اور معاشرتی تنظیم کے ذریعے اس کام کو معاشرے کی سطح پر منظم کر لیا جائے تو بڑی حد تک فرد، معاشرے اور ریاست میں اسلام آ جائے گا۔ جب فرد کی اصلاح ہو جائے گی اور وہ معاشرے اور ریاست میں اپنے کردار کو بھی مطابق اسلام بنا لے گا تو معاشرہ اور ریاست بڑی حد تک اسلامی ہوتے چلے جائیں گے۔ اور جو کسر باقی رہے اس کے لیے سافٹ انقلاب منظم کیا جانا چاہیے۔ فرد اور معاشرے کی دونوں سطحوں پر کما حقہٗ عمل ہو جائے تو سافٹ انقلاب لانا زیادہ مشکل نہ ہو گا کیونکہ اس کے لیے فضا تو پہلے ہی ہموار ہو چکی ہو گی۔ سافٹ انقلاب سے مراد ہے حکومت اور حکومتی نظام کی پرامن تبدیلی، عوام کو منظم کر کے، بغیر مسلح مزاحمت کے۔ ہماری آنکھوں دیکھتے دنیا میں سافٹ انقلاب آئے ہیں اور آ رہے ہیں، مسلم دنیا میں بھی آ سکتے ہیں اور پاکستان میں بھی۔

اس سافٹ انقلاب کا مقصد نظام بدلنا ہو گا نہ کہ حکومت بدلنا (جیسا کہ مثلاً ایران میں ہوا) نئے اسلامی سیاسی نظام کا مقصود یہ ہو گا کہ ریاست کا سیاسی ڈھانچہ اور اس کے سارے ادارے اسلامی تعلیمات کے مطابق اور اسلامی مقاصد کے لیے کام کریں۔ عصر حاضر کی اسلامی ریاست کا سیاسی نظام کیسا ہو گا؟ اس کی اصولی بنیادوں کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

۴۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہماری رائے میں عصر حاضر میں کسی مسلمان ملک میں مغربی جمہوریت پر عمل یا (اسلام اور مغربی جمہوریت کے مرکب) 'اسلامی جمہوریت' پر عمل صحیح اجتہاد نہیں ہے اور عملاً بھی یہ تجربہ ناکام ثابت ہو چکا ہے تاہم جب تک صحیح اسلامی متبادل سامنے نہیں آتا، ہم قاضی اظہار الحق صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں اگرچہ اپنے منہاج عمل سے اسلام تو نہیں لا سکیں، ریاست کے کردار کو اسلامی نہیں بنا سکیں اور نہ معاشرے میں اسلام لا سکی ہیں، تاہم وہ سیکولرزم اور لبرل

ازم کی علمبردار قوتوں کو بریک ضرور لگا سکتی ہیں اور لگائے ہوئے ہیں۔ تو یہ کام بھی ایک حد تک مفید ہے اور سراہے جانے کے قابل۔ لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی افادیت ہے یا نہیں؟ وہ تو ہے ہی لیکن اصل مسئلہ فکری سطح پر یہ ہے کہ ہماری جو دینی اصلاحی جماعت لوگوں کے کلمے سیدھے کراتی اور انہیں نماز روزے کا پابند بناتی ہے وہ بلاشبہ ایک نیک کام کر رہی ہے لیکن اصل مشکل اس کا یہ ادعا ہے کہ وہ پورا دین پیش کر رہی ہے بلکہ صرف وہی پورا اور صحیح دین پیش کر رہی ہے۔

اسی طرح جو دینی سیاسی جماعت اپنی سیاسی جدوجہد سے غیر اسلامی سیاسی قوتوں کا راستہ روک رہی ہے بلاشبہ وہ اچھا کام کر رہی ہے لیکن اصل مشکل اس کا یہ ادعا ہے کہ وہ پورا دین پیش کر رہی ہے بلکہ صرف وہی پورا اور صحیح دین پیش کر رہی ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ ان تحریکوں (اور ان سے منسلک اداروں اور افراد) کا یہ طرزِ عمل، دین کے صحیح اور متوازن تصور کا نقیض ہے اور نئے اجتہاد پر مبنی مجوزہ سیاسی حکمت عملی کا بھی۔

۵۔ ہم نے اپنا نقطۂ نظر اختصار سے پیش کیا ہے اللہ کرے یہ اختصار فہم میں مخل نہ ہو۔ اگر ہم ذرا تفصیل سے لکھتے تو مضمون پھیل کر ایک ماہنامے کے دائرے سے نکل جاتا اور یہ اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں تھا۔ ویسے اس موضوع اور اس کے متعلقات پر ہم نے اپنی کتابوں میں کئی جگہ تفصیل سے لکھا ہے اور البرہان میں بھی لکھتے رہتے ہیں، اس لیے البرہان کے باقاعدہ قارئین کے لیے ان مطالب کی تفہیم مشکل نہیں ہونی چاہیے۔

۶۔ البرہان علمی تبادلۂ خیال کا ایک پلیٹ فارم ہے۔ ہم مناظرہ بازی میں یقین نہیں رکھتے۔ پروفیسر قاضی اظہار الحق صاحب نے ہماری ایک رائے پر اعتراض کیا، ہم نے اس کا جواب دے دیا۔ قارئین نے طرفین کا نقطۂ نظر پڑھ لیا اور سمجھ لیا وہ غور کر کے جو رائے چاہیں قائم کریں۔ قصہ ختم۔ ہم جواب اور جواب الجواب کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے۔ تاہم اگر ہماری کوئی بات واضح نہیں ہے یا ہم نے نئے مباحث اٹھا دیے ہیں جن کے خلاف قاضی صاحب یا کوئی دوسرے صاحب علم اپنے دلائل رکھتے ہیں تو اس علمی بحث کے لیے البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

پاکستانیات مدیر

امریکی سائے میں
سوشلزم کے مردہ گھوڑے کو زندہ کرنے کا سٹنٹ

- پچھلے دنوں پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں طلبہ یونین کی بحالی کے نام پر سرخ سویرے کے حق میں عورتوں کی مادر پدر آزادی کے نعرے لگائے گئے، فوج کو گالیاں دی گئیں اور توہین نبوت کے قانون کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا۔

- اس سرخ مارچ کے لاہور کے شرکاء پر جو مقدمہ قائم کیا گیا ہے اس میں وزیرستان کے ایم این اے علی وزیر کے بھتیجے عالم گیر وزیر کا نام بھی شامل ہے۔ اس سے دھیان اس طرف جاتا ہے کہ شاید اس تحریک کے پیچھے پشتون تحفظ تحریک ہے جس کی اسلام اور پاکستان سے وفاداری مشکوک ہے اور اس کے پس پردہ اسلام اور مسلم دشمن بیرونی طاقتیں سرگرم ہیں۔

- اس تحریک میں مردان یونیورسٹی میں توہین رسالت کے الزام میں قتل ہونے والے مشال خاں کے والد اقبال لالہ کی شرکت سے ثابت ہو گیا کہ بیٹا بھی ایسا ہی تھا۔

لاہور، اسلام آباد اور دیگر شہروں میں پچھلے دنوں سرخ مارچ منعقد ہوا۔ عورت کو مرد کی غلامی سے نجات دلانے (بلکہ مرد کو عورت کے ہاتھوں ذلیل کرنے) کے سمبل کے طور پر ایک مرد کے گلے میں پٹہ ڈالا گیا جسے دو عورتیں کھینچ رہی تھیں۔ طلبہ حقوق کی بجائے نعرے حکومت اور قومی سلامتی کے اداروں کے خلاف لگائے جاتے رہے۔ احتجاج کرنے والوں نے پوسٹر یونیورسٹیوں، کالجوں اور ہاسٹل میں فیسوں میں کمی کے پکڑ رکھے تھے لیکن نعرے سرخ انقلاب کے لگائے جاتے رہے اور ''سرخ ہوگا، سرخ ہوگا، ایشیا اب سرخ ہوگا'' کی گردان بار بار دہرائی گئی۔

یہ لوگ بات تو غریبوں کی کرتے رہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس مارچ کے لیے کروڑوں کے فنڈز کہاں سے آئے؟ جو طلباء چند ہزار فیس نہیں دے سکتے اور اس میں کمی کا مطالبہ کر رہے تھے انہوں نے اس مارچ کے لیے کروڑوں کے فنڈز کہاں سے لیے؟ یہ امر بھی حیران کن ہے کہ یہ مارچ ایشیا کو سرخ کرنے کے لیے تھا لیکن بھرپور کوریج مغربی میڈیا کرتا رہا حالانکہ وہ تو خود اس سرخی کے سخت خلاف ہے۔

جس طرح سے نوجوانوں کے جذبات ابھارے گئے اور جس انداز کی نعرے بازی کی گئی

وہ اس امر کی مظہر تھی کہ یہ تحریک نوجوانوں کو ریاست کے خلاف کھڑا کرنے کے لیے تھی۔ مارچ کے لیے جو پوسٹرز بنائے گئے تھے ان میں یہ تاثر دیا گیا کہ علماء اور دینی طبقے اس نام نہاد سٹوڈنٹ مارچ سے خوفزدہ ہیں۔ اس مارچ کا بنیادی نعرہ تھا۔ ''جب لال لال لہرائے گا تو ہوش ٹھکانے آئے گا''۔ سرفروشی کی تمنا، دستِ قاتل کو آزمانے کی نعرے بازی، کیا یہ کسی محاذ جنگ کی تیاری تھی یا طلبا کا احتجاج؟ کیا یہ تعلیمی اداروں میں باغیانہ ماحول بنانے، مخالفین کے ہوش ٹھکانے لگانے اور بازوئے قاتل آزمانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟ سوچنے کی بات ہے کہ جب یہ چار جڈ طلبہ وطالبات اپنے تعلیمی اداروں میں پہنچیں گے تو پھر اختلاف رائے رکھنے والوں سے کیا ان کا تصادم نہیں ہوگا؟ اگر کسی نے مخالفت کر دی تو کیا یہ اس کے ہوش ٹھکانے نہیں لگا دیں گے؟

کیا یہ ملک میں ایک اور پریشر گروپ بنانے کی کوشش تھی؟ سرخ انقلاب تو کب کا افغانستان کی پہاڑیوں میں دفن ہو چکا۔ سوشلزم تو خود روس اور چین میں شکست کھا چکا تو اب یہ سرخے اچانک کہاں سے برآمد ہو گئے ہیں؟ مغربی میڈیا کیوں ان کا حمایتی ہے جو سوشلزم کا سب سے بڑا مخالف ہے؟ طلبہ حقوق کی آڑ میں ان لوگوں کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ کیا یوں کسی گروہ کو دھمکی آمیز نعرے لگانے اور گلے میں پٹہ ڈال کر گھٹیا حرکتیں کرنے کی اجازت ہونی چاہیے؟

اس سرخ طلبہ مارچ کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ اس میں ایک پوسٹر پر ''Expunge 295C'' کا نعرہ درج تھا۔ مطلب یہ کہ آئین کے آرٹیکل 295C کو ختم کیا جائے جو توہین رسالت کی سزا سے متعلق ہے۔ سوال یہ ہے کہ طلبہ حقوق سے اس قانون کے خاتمے کے مطالبے کا کیا تعلق ہے؟

لاہور میں جن لوگوں پر اسلام اور پاکستان مخالف نعروں کے الزام میں مقدمہ درج کیا گیا ان میں وزیرستان کے ایم این اے علی وزیر کے بھتیجے عالم گیر وزیر کا نام بھی شامل ہے جس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ یہ اس پشتون تحفظ تحریک کا پاور شو تھا جس کی اسلام اور پاکستان سے وفاداری مشکوک ہے۔ اس میں مشال خاں کے والد اقبال لالہ کا نام بھی موجود ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ اس کا بیٹا جس الزام میں قتل کیا گیا تھا وہ غلط نہیں تھا کیونکہ یہ پوری فیملی ہی دین بیزار لگتی ہے اور اس کے والد کا ''مظلوم'' بننا صِرف شفقت پدری کی وجہ سے تھا جب کہ وہ اور اس کا بیٹا درحقیقت ظالم تھے کیونکہ جو آقائے دوجہاں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کرتا ہے وہ ظالم ہے، مظلوم نہیں۔ (عاصم حفیظ کے کالم 'ذرا سی بات' سے مستفاد)

تعلیم و تربیت پروفیسر ملک محمد حسین

نا قابلِ یقین

ایک وائس چانسلر کا پروفیسروں اور طلبہ کو لے کر آئین توڑنے والے فوجی آمر کی حمایت میں جلوس نکالنا اور عدالتی فیصلے کی تضحیک کرنا نا قابل تصور ہے

صبح سویرے کینیڈا سے ایک دوست کا فون آیا کہ ٹی وی پر خبر چل رہی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر نے جنرل پرویز مشرف کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے یونیورسٹی کے سٹاف اور طلبہ کی ایک بڑی ریلی نکالی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ اپنی آنکھوں کا علاج کروائیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر اس طرح کا غیر سنجیدہ بلکہ گھٹیا اور ذلت آمیز کام کرے۔ پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر پاکستان کی اکیڈمک کمیونٹی کا ایکمعتبر نام ہوتا ہے اس سے ہم اس قسم کے واہیات عمل کی توقع نہیں کرسکتے کجا یہ کہ وہ جنرل پرویز مشرف جیسے بدنام زمانہ اور غاصب حکمران کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی کے باعزت تعلیمی کیمپس میں طلبا اور اساتذہ کی ریلی منعقد کرے۔ بفرضِ محال اگر کوئی وائس چانسلر ایسی کوئی حماقت کرنا بھی چاہے تو پنجاب یونیورسٹی کے باغیرت طلبہ اور پنجاب یونیورسٹی کا حریت پسند اکیڈمک سٹاف اس طرح کے احمقانہ اقدام کا ساتھ نہیں دے گا۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کردیا کہ شاید یہ خبر جعلی ہو۔

اس فون کے بعد میرے ذہن میں جو بے چینی پیدا ہوئی تھی وہ بڑھتی رہی حتیٰ کہ میں نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر دوست کو فون کرکے اس جان لیوا خبر کی تصدیق چاہی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے زخمی دل کے ساتھ تصدیق کی کہ یہ حادثہ فاجعہ ہو چکا ہے اور خبر تمام ٹی وی چینلز پر نشر ہونے کے ساتھ ساتھ اخبارات میں بھی مع فوٹو آچکی ہے۔ سچی بات ہے کہ یہ سب کچھ سننے اور جاننے کے بعد تو میں مایوسی اور اضطراب کی آخری حدوں کو چھو رہا ہوں۔ ٹی وی اینکرز، دانشوروں، سیاسی جماعتوں کے نام نہاد لیڈروں، ماہرین قانون کی منافقتوں، حکومتی وزیروں کی عزت دار ججوں کے خلاف کھلی بکواس سن کر جو جہانِ حیرت کا

ماحول سامنے آرہا تھا وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے اس بے ہودہ عمل کے بعد بڑی عام سی بے اعتدالی نظر آئی۔

سپیشل کورٹ کے جنرل پرویز مشرف کے خلاف فیصلے نے ہمارے معاشرے کے عقل دخرد، تدبر و تفکر اور دیانت کو بالکل ننگا کر کے رکھ دیا ہے۔ خلط مبحث کیا ہوتا ہے وہ اس مسئلہ پر اتنا واضح ہوا ہے کہ جس کی کوئی مثال نہیں۔ اس معاشرے میں کبھی قانون اور انصاف بھی سر بلند ہوگا؟ اس کی مکمل نفی ہوئی ہے۔ اگر قومی زندگی کے ۷۲ سالوں میں پہلی دفعہ سپیشل کورٹ کے دو ججوں نے جرأت کرہی لی تھی تو ان کی تحسین کی جاتی۔ انصاف کا بول بالا کرنے کو تقویت دی جاتی لیکن یہ کیا کہ عدل وانصاف اور آئین دوستور کے خلاف ایک ادھم مچا دیا گیا اور عزت دار منصفوں کو بے عزت کر کے رکھ دیا گیا اور وہ جس نے دو دفعہ آئین کی بے حرمتی کی، امریکی وزیر خارجہ کے سامنے بزدلوں کی طرح ڈھیر ہو گیا، ملک کے ہوائی اڈے اور فضائیں اسلام اور مسلم دشمن امریکہ کو دیں کہ ہمارے بھائیوں پر ہزاروں جان لیوا بم گرائے اور کارپٹ بمباری کر کے پورے ملک کو تاخت وتاراج کر دے، جس نے سیکڑوں شہری ڈالروں کے عوض امریکہ کو بیچے، جس نے قوم کی بیٹی عافیہ صدیقی کو اس کے بچوں سمیت ظالم امریکیوں کے ہاتھ فروخت کیا، جس نے اپنے بھائی اسلامی ملک کے سفیر کو ننگا کر کے پشاور ائیر پورٹ پر دشمن امریکیوں کے حوالے کیا، جس نے ملک کے اندر وہ جرائم کیے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تو اس غاصب اور آمر کے خلاف جب سپیشل کورٹ کے دو عظیم جج انصاف اور قانون پر مبنی فیصلہ دیتے ہیں تو طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ایک شخص کی ذاتی فعل پر سزا کو پوری قوم کی سزا بنا دیا جاتا ہے تو اس صورت میں مایوسی اور اضطراب کا پیدا ہونا فطری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ صحیح فکر کے ساتھ درست سوچ پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور قوم کو ذلت کے گڑھے سے نکالنے کی ہمت عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

تبصرئہ کتب مدیر

کتاب نما

'شاتم کی سزا اور مصلحتوں کا لحاظ' اور 'گستاخ منافق اور سیدنا عمر فاروقؓ کا اقدام'

از علامہ محمد خلیل الرحمن قادری

ان دو کتابوں میں علامہ قادری صاحب نے متجد دین خصوصاً عمار ناصر صاحب کی ان 'علمی کاوشوں' اور 'مدلل آرا'' کا رد کرتے ہوئے اس گرد کو صاف کر دیا ہے جو وہ توہین رسالت کے حوالے سے جمہور علماء و مسلمین کے مروجہ موقفکے بارے میں اٹھاتے رہے ہیں ۔ ان متجد دین کی خوبی یہ ہے کہ وہ بات تحمل سے، غیر جذباتی انداز میں اور دلیل کے ساتھ کرتے ہیں جس سے آج کا ایک عام پڑھا لکھا آدمی، جس کا دین کا مطالعہ نہیں ہے اور وہ دینی افکار واحکام کی حکمت واستدلال سے ناواقف ہے، وہ ان متجد دین کی اس ''ٹھوس علمی روش'' سے متاثر ہو جاتا ہے اور ان کے موقف کو صحیح سمجھنے لگتا ہے۔

علامہ قادری صاحب کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے جذباتی ہوئے بغیر معروضی علمی انداز میں ان متجد دین کی فکری غلطیوں اور مغالطوں کو دلائل سے ردّ کیا ہے اور ان کی اس 'معروضیت' اور 'علمی استدلال' کا پول کھول دیا ہے جو درحقیقت گہرے علمی افلاس، مغرب پرستی اور دینی حمیت سے محرومی پر مبنی ہے۔ ہم ان تلخ الفاظ کے لیے معذرت نہیں کریں گے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ متجد دین مستشرقین کی انہی علمی آراء کی جگالی کرتے ہیں جو انہوں نے مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی کے پردے میں چھپا رکھی ہیں ورنہ آپ ہی بتایئے کہ عمار ناصر صاحب کی اس رائے کا کیا مطلب ہے کہ بیت المقدس پر مسلمانوں کی بجائے یہودیوں کا حق فائق ہے! یا ان کے اس موقف کا کیا مقصد ہے جب وہ علمی چالاکی سے شاتم رسول کی سزا کے بارے میں چند حنفی علماء کے اختلاف کو سارے جمہور علماء کے موقف پر پانی پھیرنے کے لیے اُس وقت اچھالتے ہیں جب مسلمانوں کے دل بعض بدبختوں کی اہانت رسول کی وجہ سے زخمی ہوں اور شاتم کو سزا دینے کے لیے مہم چل رہی ہو اور مغرب توہین رسالت کے اس قانون کو ختم کرنے کے لیے پورا زور لگا رہا ہو۔ اس کا مقصد اور نتیجہ اس کے سوا کیا ہے کہ شاتم رسول کو سزا نہ ملے بالفاظ دیگر کھلی چھٹی ہو کہ لوگ اہانت رسول کرتے رہیں اور انہیں کوئی سزا نہ ملے۔ مغرب کی محبت اور پیروی میں اختیار کیے گئے اس اسلوب کو اگر ہم توہین رسالت کی بالواسطہ حمایت نہ کہیں تو کیا کہیں؟

کتاب 'شاتم کی سزا اور مصلحتوں کا لحاظ' میں علامہ قادری صاحب نے عمار ناصر صاحب کی ذکر کردہ ان ''مصلحتوں'' کو جنہیں انہوں نے بعض احادیث سے مستنبط کیا ہے (تاکہ شاتم رسول کو سزا نہ ملے) علمی طور پر رد کیا ہے اور انہیں سنت ثابتہ اور اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ثابت کیا ہے اور جمہور علماء کے اس مسلک کی تصویب کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ذاتی استحقاق تھا کہ وہ اپنی اہانت کرنے والوں میں سے جس کو چاہیں سزا دیں اور جسے چاہیں معاف کردیں اور یہ کہ ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ اس اختیار کو استعمال کریں بلکہ مسلم ریاست کا یہ فرض ہے کہ جو اہانت رسول کرے وہ اسے سزا دے اور اگر کوئی غیرت مند مسلمان ریاست وعدالت پر سبقت لیتے ہوئے ایسے مباح الدم گستاخِ رسول کو جہنم رسید کردے تو وہ اس کے محرکات کو دیکھے اور جانچے۔ اگر اس کا محرک کچھ اور ہو تو اسے قصاصاً قتل کردے اور اگر اس کا محرک غیرتِ دینی ہی ہو تو اسے اسوۂ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق بری کردے۔

اپنی دوسری کتاب 'گستاخ منافق اور سیدنا عمر فاروقؓ کا اقدام' میں علامہ قادری صاحب نے متجدد عمار ناصر صاحب کے اس استدلال کو خام ثابت کیا ہے جو وہ اس حدیث کو 'ضعیف' ثابت کرنے کے لیے سامنے لاتے ہیں جس کی رو سے حضرت عمر فاروقؓ نے اس منافق مسلمان کو اہانت رسول کے جرم میں قتل کردیا تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر راضی نہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے ان کے پاس فیصلے کے لیے آیا تھا۔ یاد رہے کہ حضرت عمرؓ کے علاوہ کئی اور واقعات ایسے ہیں جو صحیح احادیث میں مذکور ہیں، کہ کئی صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھے بغیر بعض گستاخانِ رسول کو جہنم واصل کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کسی کو سزا نہ دی بلکہ بعض کی تحسین بھی کی۔ دونوں کتابیں مکتبہ کریمیہ، ۹۹، k بلاک، جوہر ٹاؤن لاہور سے دستیاب ہیں۔

'مادیت وروحانیت کی کشمکش اور اس کے اثرات ونتائج'، از حافظ محمد موسیٰ بھٹو

اللہ تعالیٰ نے حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کے قلم کو روانی عطا فرمائی ہے اور وہ برسوں سے مغرب کی دجالی تہذیب کے خلاف اور تزکیۂ نفس کے حق میں مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان کی تحریریں اس قابل ہیں کہ وہ ہر مسلمان تک پہنچیں اور لوگ ان سے استفادہ کریں۔ اس مختصر کتاب میں انہوں نے پاکستانی مسلمانوں کو جھنجوڑا ہے کہ وہ مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے برے اثرات سے بچیں اور اپنے تزکیہ کا اہتمام کریں کیونکہ جو معاشرہ تزکیۂ نفس کے اہتمام سے غافل ہوجائے اس کا دین سے دور ہونا، اخلاقی بحران میں مبتلا ہوجانا اور تباہی کے راستے پر چل پڑنا اس تغافل کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ کتاب سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، 400-B لطیف آباد، حیدآباد سے طلب کی جاسکتی ہے۔